زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہنامہ اشراق

فروری 2026ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہنامہ

جلد ۴ شمارہ ۲ فروری ۲۰۲۶ء شعبان المعظم / رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

معاون مدیر: شاہد محمود

مجلس تحریر:

ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر محمد عامر گزدر

ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

فہرست

شذرات

روزہ — جاوید احمد غامدی — 3

اخلاقیات کی پانچ حرمتیں — سید منظور الحسن — 26

عورت کی تادیب: مخاطب شوہر یا معاشرہ؟ — محمد حسن الیاس — 30

قرآنیات

البیان: آل عمران 3:130-148 (8) — جاوید احمد غامدی — 35

معارف نبوی

احادیث — محمد حسن الیاس — 39

آثارِ صحابہ

سردارانِ فارس اور صحابہ کے مابین مکالمے (16) — ڈاکٹر عمار خان ناصر — 41

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

اسرا و معراج: تفہیم و تبیین جاوید احمد غامدی (7) — سید منظور الحسن — 52

نقد و نظر

رمضان کی راتوں میں حرمتِ اکل و مباشرت — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 61

صلاۃ التسبیح: فقہ و حدیث کی روشنی میں (5) — ڈاکٹر محمد عامر گزدر — 68

نقطۂ نظر

علاماتِ قیامت اور تاریخی واقعات: بائیبل اور قرآن کی روشنی میں (9) — محمد سعد سلیم — 82

مکالمات

مطالعۂ مسندِ احمد (5) — ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن — 88

رمضان اور تعلق باللہ — محمد حسن الیاس / شاہد رضا — 103

سیر و سوانح

حیاتِ امین (29) — نعیم احمد بلوچ — 110

ادبیات

عربی ادب قبل از اسلام: قدیم عرب کا دیگر اقوامِ عالم سے ربط ضبط اور اجنبی ثقافتوں کا اثر — ڈاکٹر خورشید رضوی — 117

کہاں ہوں میں کہ مرا کوئی آشنا بھی نہیں — ڈاکٹر خورشید رضوی — 122

پھر ہوئے زینتِ دیوارِ حرم اے ساقی — جاوید احمد غامدی — 123

حالات و وقائع

خبر نامہ ”المورد امریکہ“ — شاہد محمود — 124

جاوید احمد غامدی

روزہ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ، وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ، فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ، وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ، اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ. شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ، هُدًى لِّلنَّاسِ، وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ، فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ، وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ. یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ، وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ، وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ، وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.

(البقرہ2: 183-185)

”ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ۔ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ اِس پر بھی جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ اور جو اِس کی طاقت رکھتے ہوں (کہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں) تو اُن پر ہر روزے کا بدلہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ پھر جو شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے، اور روزہ رکھ لو تو یہ تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے، اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ رمضان کا مہینا ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کے لیے سراسر ہدایت بنا کر

اور نہایت واضح دلیلوں کی صورت میں جو (اپنی نوعیت کے لحاظ سے) رہنمائی بھی ہیں اور حق و باطل کا فیصلہ بھی۔ سو تم میں سے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُسے چاہیے کہ اِس کے روزے رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں یہ گنتی پوری کر لے۔ (یہ رخصت اِس لیے دی گئی ہے کہ) اللہ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے اور نہیں چاہتا کہ تمھارے ساتھ سختی کرے۔ اور (فدیے کی اجازت) اِس لیے (ختم کر دی گئی ہے) کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو، (اور جو خیر و برکت اُس میں چھپی ہوئی ہے، اُس سے محروم نہ رہو)۔ اور (اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا) اِس لیے (خاص کیا گیا ہے) کہ (قرآن کی صورت میں) اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر اُس کی بڑائی کرو اور اِس لیے کہ تم اُس کے شکر گزار بنو۔ ‘‘

نماز اور زکوٰۃ کے بعد تیسری اہم عبادت روزہ ہے۔ عربی زبان میں اِس کے لیے ’صوم‘ کا لفظ آتا ہے، جس کے معنی کسی چیز سے رک جانے اور اُس کو ترک کر دینے کے ہیں۔ گھوڑوں کو تربیت دینے کے لیے جب بھوکا اور پیاسا رکھا جاتا تھا تو اہل عرب اِسے اُن کے صوم سے تعبیر کرتے تھے۔ شریعت کی اصطلاح میں یہ لفظ خاص حدود و قیود کے ساتھ کھانے پینے اور ازدواجی تعلقات سے رک جانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اردو زبان میں اِسی کو روزہ کہتے ہیں۔ انسان چونکہ اِس دنیا میں اپنا ایک عملی وجود بھی رکھتا ہے، اِس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اُس کا جذبۂ عبادت جب اُس کے اِس عملی وجود سے متعلق ہوتا ہے تو پرستش کے ساتھ اطاعت کو بھی شامل ہو جاتا ہے۔ روزہ اِسی اطاعت کا علامتی اظہار ہے۔ اِس میں بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر اور اُس کی رضا اور خوشنودی کی طلب میں بعض مباحات کو اپنے لیے حرام قرار دے کر مجسم اطاعت بن جاتا اور اِس طرح گویا زبان حال سے اِس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے حکم سے بڑی کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اگر قانون فطرت کی رو سے جائز کسی شے کو بھی اُس کے لیے ممنوع ٹھیرا دیتا ہے تو بندے کی حیثیت سے زیبا یہی ہے کہ وہ بے چون و چرا اِس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

اللہ کی عظمت و جلالت اور اُس کی بزرگی و کبریائی کے احساس و اعتراف کی یہ حالت، اگر غور کیجیے تو اُس کی شکر گزاری کا حقیقی اظہار بھی ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِسی بنا پر روزے کو خدا کی تکبیر اور شکر گزاری قرار دیا اور فرمایا ہے کہ اِس مقصد کے لیے رمضان کا مہینا اِس لیے خاص کیا گیا ہے کہ قرآن کی صورت میں اللہ نے جو ہدایت اِس مہینے میں تمھیں عطا فرمائی ہے اور جس میں عقل

کی رہنمائی اور حق و باطل کے مابین فرق و امتیاز کے لیے واضح اور قطعی حجتیں ہیں، اُس پر اللہ کی بڑائی کرو اور اُس کے شکر گزار بنو: 'وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'۔ روزے کی یہی حقیقت ہے جس کے پیش نظر کہا گیا ہے کہ روزہ اللہ کے لیے ہے اور وہی اُس کی جزا دے گا۔ یعنی بندے نے جب بغیر کسی سبب کے محض اللہ کے حکم کی تعمیل میں بعض جائز چیزیں بھی اپنے لیے ممنوع قرار دے لی ہیں تو اب وہ ناپ تول کر اور کسی حساب سے نہیں، بلکہ خاص اپنے کرم اور اپنی عنایت سے اُس کا اجر دے گا اور اِس طرح بے حساب دے گا کہ وہ نہال ہو جائے گا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابن آدم جو نیکی بھی کرتا ہے، اُس کی جزا اُسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دی جاتی ہے، لیکن روزہ اِس سے مستثنیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ 'فإنه لی وأنا أجزی به'، یہ میرے لیے ہے اور میں ہی اِس کی جزا دوں گا، اِس لیے کہ بندہ اپنے کھانے پینے اور اپنی جنسی خواہشات کو اِس میں صرف میرے لیے چھوڑ دیتا ہے۔[1] چنانچہ فرمایا ہے کہ روزہ رکھنے والوں کے لیے خوشی کے دو وقت ہیں: ایک جب وہ روزہ کھولتے ہیں، دوسرا جب وہ اپنے پروردگار سے ملاقات کریں گے۔[2] اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اِس عبادت کی اہمیت کس قدر غیر معمولی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لخلوف فم الصائم أطيب عند الله من ريح المسك. (بخاری، رقم 1894)	''روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوش بو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔''

نیز فرمایا ہے:

إن فی الجنة بابًا، يقال له الريّان، يدخل منه الصائمون يوم القيٰمة، لا يدخل منه أحد	''جنت میں ایک دروازہ ہے جسے ریّان کہا جاتا ہے۔ روزہ دار قیامت کے دن اُس سے جنت میں داخل ہوں

---

[1]۔ بخاری، رقم 1894۔ مسلم، رقم 2707۔

[2]۔ بخاری، رقم 1904۔ مسلم، رقم 2707۔

غیرھم، یقال: أین الصائمون؟ فیقومون لا یدخل منه أحد غیرھم، فإذا دخلوا أغلق فلم یدخل منه أحد.

(بخاری، رقم 1896)

گے، اُن کے ساتھ کوئی دوسرا اُس سے داخل نہ ہو سکے گا۔ پوچھا جائے گا: روزہ دار کہاں ہیں؟ اِس پر وہی اٹھیں گے، کوئی دوسرا اُن کے ساتھ اُس سے داخل نہ ہو گا۔ پھر جب داخل ہو جائیں گے تو اُسے بند کر دیا جائے گا۔ اِس کے بعد کوئی اُس دروازے سے داخل نہ ہو گا۔''

اِس عبادت کا منتہاے کمال شریعت میں یہ بتایا گیا ہے کہ آدمی روزے کی حالت میں اپنے اوپر کچھ مزید پابندیاں عائد کر کے اور دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر چند دنوں کے لیے مسجد میں بیٹھ جائے اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی عبادت کرے۔ اصطلاح میں اِسے 'اعتکاف' کہا جاتا ہے۔[3] یہ اگرچہ رمضان کے روزوں کی طرح لازم تو نہیں کیا گیا، لیکن تزکیۂ نفس کے نقطۂ نظر سے اِس کی بڑی اہمیت ہے۔ روزہ و نماز اور تلاوت قرآن کے امتزاج سے 'آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را' کی جو خاص کیفیت اِس سے پیدا ہوتی اور نفس پر تجرد و انقطاع اور تبتل الی اللہ کی جو حالت طاری ہو جاتی ہے، اُس سے روزے کا اصلی مقصود درجۂ کمال پر حاصل ہوتا ہے۔ رمضان کے آخری دس دنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اِسی بنا پر ہر سال اپنی مسجد میں معتکف ہو جاتے[4] اور اپنے روز و شب دعا و مناجات، رکوع و سجود اور تلاوت قرآن کے لیے وقف کر دیتے تھے۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے:

کان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم إذا دخل العشر، شدّ مئزرہ وأحیا لیلہ وأیقظ أھلہ.

(بخاری، رقم 2024)

''رمضان کا آخری عشرہ آتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کمر عبادت کے لیے کس لیتے، خود بھی شب بیداری فرماتے اور اپنے گھر والوں کو بھی اِس

---

[3]۔ یہ بھی ایک قدیم عبادت ہے اور انبیا علیہم السلام کے دین میں ہمیشہ موجود رہی ہے۔

[4]۔ بخاری، رقم 2025، 2026۔ مسلم، رقم 2782۔

کے لیے اٹھاتے تھے۔‘‘

روزے کی یہ عبادت مسلمانوں پر رمضان کے مہینے میں لازم کی گئی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ نفس کے میلانات کبھی ختم نہیں ہوتے اور اِس دنیا کی ترغیبات بھی ہمیشہ باقی رہتی ہیں، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس مہینے میں اپنا خاص کرم یہ فرماتے ہیں کہ شیاطین جن کے لیے لوگوں کو بہکانے کے تمام راستے بالکل بند کر دیتے ہیں۔ ارشاد فرمایا ہے: رمضان آتا ہے تو آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں۔[5] چنانچہ اِس مہینے میں ہر شخص کے لیے موقع ہوتا ہے کہ وہ اگر چاہے تو بغیر کسی خارجی رکاوٹ کے اپنے لیے خیر و فلاح کے حصول کی جدوجہد کر سکے۔ اِس کا صلہ روایتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ آدمی کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ توبہ و اصلاح کے بارے میں یہ قرآن کا عام قانون ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص رمضان کے حوالے سے لوگوں کو اِس کی بشارت اِس طرح دی ہے:

من صام رمضان إيمانًا واحتسابًا، غفر له ما تقدم من ذنبه. (بخاری، رقم 2009)	’’جس نے ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے، اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔‘‘
من قام رمضان إيمانًا واحتسابًا، غفر له ما تقدم من ذنبه. (بخاری، رقم 37)	’’جس نے ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں قیام کیا، اُس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔‘‘

یہی بات لیلۃ القدر میں قیام کے متعلق بھی کہی گئی ہے۔[6] یہ نزول قرآن کی رات ہے اور اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ فرشتے اور روح الامین اِس میں ہر معاملے کی اجازت لے کر اترتے ہیں، لہٰذا

---

[5]۔ بخاری، رقم 1899۔

[6]۔ بخاری، رقم 1901۔ مسلم، رقم 1781۔

امور مہمہ کی تنفیذ کے ساتھ خاص ہونے کی وجہ سے جو رحمتیں، برکتیں اور قرب الٰہی کے جو مواقع اِس ایک رات میں حاصل ہوتے ہیں، وہ ہزاروں راتوں میں بھی نہیں ہوسکتے۔ اِسی بنا پر ارشاد ہوا ہے کہ 'لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ'[7] (فیصلوں کی رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِسے رمضان کے آخری عشرے، خاص کر اِس کی طاق راتوں میں تلاش کرنا چاہیے۔[8]

عبادت کے لیے ایام واوقات کی یہ تعیین کیا اہمیت رکھتی ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِس کی وضاحت اِس طرح فرمائی ہے:

''... جس طرح اِس مادی دنیا میں فصلوں، موسموں اور اوقات کا اعتبار ہے، اِسی طرح روحانی عالم میں بھی اِن کا اعتبار ہے۔ جس طرح خاص خاص چیزوں کے بونے کے لیے خاص خاص موسم اور مہینے ہیں، اِن میں آپ بوتے ہیں تو وہ پروان چڑھتی اور مثمر ہوتی ہیں، اور اگر اِن موسموں اور مہینوں کو آپ نظر انداز کر دیتے ہیں تو دوسرے مہینوں کی طویل سے طویل مدت بھی اِن کا بدل نہیں ہوسکتی، اِسی طرح روحانی عالم میں بھی خاص خاص کاموں کے لیے خاص موسم اور خاص اوقات وایام مقرر ہیں۔ اگر اِن اوقات وایام میں وہ کام کیے جاتے ہیں تو وہ مطلوبہ نتائج پیدا کرتے ہیں، اور اگر وہ ایام واوقات نظر انداز ہو جاتے ہیں تو دوسرے ایام و اوقات کی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی اُن کی صحیح قائم مقامی نہیں کر سکتی۔ اِس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ جمعہ کے لیے ایک خاص دن ہے، روزوں کے لیے ایک خاص مہینا ہے، حج کے لیے خاص مہینا اور خاص ایام ہیں، وقوف عرفہ کے لیے معینہ دن ہے۔ اِن تمام ایام و اوقات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی عبادتیں مقرر کر رکھی ہیں جن کے اجر وثواب کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے، لیکن اِن کی ساری برکتیں اپنی اصلی صورت میں تبھی ظاہر ہوتی ہیں، جب یہ ٹھیک ٹھیک اِن ایام واوقات کی پابندی کے ساتھ عمل میں لائی جائیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ برکت فوت ہو جاتی ہے جو اِن کے اندر مضمر ہوتی ہے۔'' (9/468)

---

[7]۔ القدر 97:1-3۔

[8]۔ بخاری، رقم 2016، 2017، 2020۔ مسلم، رقم 2763، 2764، 2769۔

روزے کی تاریخ

نماز کی طرح روزے کی تاریخ بھی نہایت قدیم ہے۔ سورۂ بقرہ کی جو آیتیں اوپر نقل ہوئی ہیں، اُن میں قرآن نے بتایا ہے کہ روزہ مسلمانوں پر اُسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح وہ پہلی قوموں پر فرض کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ تربیت نفس کی ایک اہم عبادت کے طور پر اِس کا تصور تمام مذاہب میں رہا ہے۔

نینوا اور بابل کی تہذیب نہایت قدیم ہے۔ ایک زمانے میں یہاں آشوری قوم آباد تھی۔ سیدنا یونس علیہ السلام کی بعثت اِنھی کی طرف ہوئی۔ اِن لوگوں نے پہلے اُنھیں جھٹلا دیا، لیکن بعد میں ایمان لے آئے۔ اِس موقع پر اُن کی توبہ اور رجوع کا ذکر بائیبل کے ”صحیفۂ یونس“ میں اِس طرح ہوا ہے:

”تب نینوا کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ، سب نے ٹاٹ اوڑھا۔ اور یہ خبر نینوا کے بادشاہ کو پہنچی اور وہ اپنے تخت پر سے اٹھا اور بادشاہی لباس کو اتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ اور اُس کے ارکان دولت کے فرمان سے نینوا میں یہ اعلان کیا گیا اور اِس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان، گلہ یا رمہ کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پیے، لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبس ہوں اور خدا کے حضور گریہ و زاری کریں، بلکہ ہر شخص اپنی بری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔“ (3:5-8)

عرب جاہلی میں بھی روزہ کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ اُن کی زبان میں لفظ ’صوم‘ کا وجود بجاے خود اِس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اِس عبادت سے پوری طرح واقف تھے۔ ”المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام“ میں جواد علی لکھتے ہیں:

”روایتوں میں ہے کہ قریش یوم عاشور کا روزہ رکھتے تھے۔ اِس روز وہ جمع ہوتے، عید مناتے اور بیت اللہ کو غلاف پہناتے تھے۔ اِس کی توجیہ مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ قریش جاہلیت میں کوئی ایسا گناہ کر بیٹھے تھے جس کا بوجھ اُنھوں نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ چنانچہ اِس کا کفارہ ادا کرنا چاہا تو یوم عاشور کا روزہ اپنے لیے مقرر کر لیا۔ وہ اِس دن یہ روزہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے رکھتے تھے کہ اُس نے اُنھیں اِس گناہ کے برے نتائج سے محفوظ رکھا۔ روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبوت سے پہلے یہ روزہ رکھتے تھے... اِس

روزے کی ایک توجیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قریش کو ایک زمانے میں قحط نے آلیا، پھر اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اِس سے نجات عطا فرمائی تو اُنھوں نے اِس پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے یہ روزہ رکھنا شروع کر دیا۔‘‘(6/339-340)

یہود و نصاریٰ کی شریعت میں بھی روزہ ایک عام عبادت ہے۔ بائیبل میں اُن کے روزوں کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے اور اِس کے لیے خاص اِس لفظ کے علاوہ بعض مقامات پر ’جان کو دکھ دینے‘ اور ’نفس کشی کرنے‘ کی تعبیرات بھی اختیار کی گئی ہیں۔

خروج میں ہے:

’’اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو یہ باتیں لکھ، کیونکہ اِنھی باتوں کے مفہوم کے مطابق میں تجھ سے اور اسرائیل سے عہد باندھتا ہوں۔ سو وہ چالیس دن اور چالیس رات وہیں خداوند کے پاس رہا اور نہ روٹی کھائی اور نہ پانی پیا اور اُس نے اُن لوحوں پر اِس عہد کی باتوں کو، یعنی دس احکام کو لکھا۔‘‘(34:27-28)

احبار میں ہے:

’’اور یہ تمھارے لیے ایک دائمی قانون ہو کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ کو تم اپنی اپنی جان کو دکھ دینا اور اُس دن کوئی، خواہ وہ دیسی ہو یا پردیسی جو تمھارے بیچ بود و باش رکھتا ہو، کسی طرح کا کام نہ کرے۔ کیونکہ اُس روز تمھارے واسطے تم کو پاک کرنے کے لیے کفارہ دیا جائے گا۔ سو تم اپنے سب گناہوں سے خداوند کے حضور پاک ٹھیرو گے۔ یہ تمھارے لیے خاص آرام کا سبت ہو گا۔ تم اُس دن اپنی اپنی جان کو دکھ دینا۔‘‘(16:29-31)

قضاۃ میں ہے:

’’تب سب بنی اسرائیل اور سب لوگ اٹھے اور بیت ایل میں آئے اور وہاں خداوند کے حضور بیٹھے روتے رہے اور اُس دن شام تک روزہ رکھا اور سوختنی قربانیاں اور سلامتی کی قربانیاں خداوند کے آگے گزرانیں۔‘‘(20:26)

سموئیل دوم میں ہے:

’’اور وہ ساؤل اور اُس کے بیٹے یونتن اور خداوند کے لوگوں اور اسرائیل کے گھرانے کے لیے نوحہ کرنے اور رونے لگے اور شام تک روزہ رکھا، اِس لیے کہ وہ تلوار سے مارے گئے تھے۔‘‘ (1:12)

”اِس لیے داؤد نے اُس لڑکے کی خاطر خدا سے منت کی اور داؤد نے روزہ رکھا اور اندر جا کر ساری رات زمین پر پڑا رہا۔“(16:12)

نحمیاہ میں ہے:

”پھر اِسی مہینے کی چوبیسویں تاریخ کو بنی اسرائیل روزہ رکھ کر اور ٹاٹ اوڑھ کر اور مٹی اپنے سر پر ڈال کر اکٹھے ہوئے۔ اور اسرائیل کی نسل کے لوگ سب پردیسیوں سے الگ ہو گئے اور کھڑے ہو کر اپنے گناہوں اور اپنے باپ دادا کی خطاؤں کا اقرار کیا۔“(9:1-2)

زبور میں ہے:

”لیکن میں نے تو اُن کی بیماری میں، جب وہ بیمار تھے، ٹاٹ اوڑھا اور روزہ رکھ رکھ کر اپنی جان کو دکھ دیا اور میری دعا میرے ہی سینے میں واپس آئی۔“(13:35)

یرمیاہ میں ہے:

”پر تو جا اور خداوند کا وہ کلام جو تو نے میرے منہ سے اِس طومار میں لکھا ہے، خداوند کے گھر میں روزہ کے دن لوگوں کو پڑھ کر سنا۔“(6:36)

یوایل میں ہے:

”خداوند کا روز عظیم نہایت خوف ناک ہے۔ کون اُس کی برداشت کر سکتا ہے؟ لیکن خداوند فرماتا ہے: اب بھی پورے دل سے اور روزہ رکھ کر اور گریہ وزاری و ماتم کرتے ہوئے میری طرف رجوع لاؤ۔ اور اپنے کپڑوں کو نہیں، بلکہ دلوں کو چاک کر کے خداوند اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو، کیونکہ وہ رحیم و مہربان، قہر کرنے میں دھیما اور شفقت میں غنی ہے اور عذاب نازل کرنے سے باز رہتا ہے۔“(2:11-12)

زکریا میں ہے:

”پھر رب الافواج کا کلام مجھ پر نازل ہوا کہ رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ چوتھے اور پانچویں اور ساتویں اور دسویں مہینے کا روزہ بنی یہوداہ کے لیے خوشی اور خرمی کا دن اور شادمانی کی عید ہو گا۔“(8:18-19)

متی میں ہے:

”اور جب تم روزہ رکھو تو ریاکاروں کی طرح اپنی صورت اداس نہ بناؤ، کیونکہ وہ اپنا منہ بگاڑتے

ہیں تاکہ لوگ اُن کو روزہ دار جانیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے، بلکہ جب تو روزہ رکھے تو اپنے سر میں تیل ڈال اور منہ دھو تاکہ آدمی نہیں، بلکہ تیرا باپ جو پوشیدگی میں ہے، تجھے روزہ دار جانے۔ اِس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، تجھے بدلہ دے گا۔" (6:16-18)

اعمال میں ہے:

"جب وہ خداوند کی عبادت کر رہے اور روزے رکھ رہے تھے تو روح القدس نے کہا: میرے لیے برنباس اور ساؤل کو اِس کام کے واسطے مخصوص کر دو، جس کے واسطے میں نے اُن کو بلایا ہے۔ تب اُنھوں نے روزہ رکھ کر اور دعا کر کے اور اُن پر ہاتھ رکھ کر اُنھیں رخصت کیا۔"

(13:2-3)

یہ روزے کی تاریخ ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزہ بھی قرآن کے مخاطبین کے لیے کوئی اجنبی چیز نہ تھی۔ وہ اِس کی مذہبی حیثیت اور اِس کے حدود و شرائط سے پوری طرح واقف تھے۔ چنانچہ قرآن نے جب اِس کا ذکر کیا تو اِن حدود و شرائط میں سے کوئی چیز بھی بیان نہیں کی، بلکہ ہدایت فرمائی کہ خدا کے ایک قدیم حکم اور انبیا علیہم السلام کی ایک قدیم سنت کے طور پر وہ جس طرح اِسے جانتے ہیں، اُسی طرح ایک لازمی عبادت کے طور پر اِس کا اہتمام کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے اِس سے پہلے اِسی کے مطابق رمضان کے روزے رکھے اور مسلمان نسلاً بعد نسلٍ اب اِسی طریقے کی پیروی کر رہے ہیں۔ اِس لحاظ سے روزے کا ماخذ بھی اصلاً مسلمانوں کا اجماع اور اُن کا عملی تواتر ہی ہے۔ قرآن نے اِس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ اِسے فرض قرار دیا، مریضوں اور مسافروں کے لیے اِس سے رخصت کا قانون بیان فرمایا اور بعد میں جب بعض سوالات اِس سے متعلق پیدا ہوئے تو اُن کی وضاحت کر دی ہے۔

روزے کا مقصد

روزے کا مقصد قرآن مجید نے سورۂ بقرہ کی اِن آیتوں میں یہ بیان کیا ہے کہ لوگ خدا سے ڈرنے والے بن جائیں۔ اِس کے لیے اصل میں 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ' کے الفاظ آئے ہیں، یعنی تمھارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔ قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے

شب و روز کو اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر رکھ کر زندگی بسر کرے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اِس بات سے ڈرتا رہے کہ اُس نے اگر کبھی اِن حدود کو توڑا تو اِس کی پاداش سے اللہ کے سوا کوئی اُس کو بچانے والا نہیں ہو سکتا۔

روزے سے یہ تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ اِس کو سمجھنے کے لیے تین باتیں پیش نظر رہنی چاہییں:

پہلی یہ کہ روزہ اِس احساس کو آدمی کے ذہن میں پوری قوت کے ساتھ بیدار کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے۔ نفس کے چند بنیادی مطالبات پر حرمت کا قفل لگتے ہی یہ احساس بندگی پیدا ہونا شروع ہوتا اور پھر بہ تدریج بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ روزہ کھولنے کے وقت تک یہ اُس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا ہے۔ فجر سے مغرب تک کھانے کا ایک نوالہ اور پانی کا ایک قطرہ بھی روزے دار کے حلق سے نہیں گزرتا اور وہ اِن چیزوں کے لیے نفس کے ہر مطالبے کو محض اپنے پروردگار کے حکم کی تعمیل میں پورا کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ روزے کا یہ عمل جب بار بار دہرایا جاتا ہے تو یہ حقیقت روزے دار کے نہاں خانۂ وجود میں اتر جاتی، بلکہ اُس کی جبلت میں پیوست ہو جاتی ہے کہ وہ ایک پروردگار کا بندہ ہے اور اُس کے لیے زیبا یہی ہے کہ زندگی کے باقی معاملات میں بھی تسلیم و اعتراف کے ساتھ وہ اپنے مالک کی فرماں روائی کے سامنے سپر ڈال دے اور خیال و عمل، دونوں میں اپنی آزادی اور خود مختاری کے ادعا سے دستبردار ہو جائے۔ اِس سے، ظاہر ہے کہ خدا پر آدمی کا ایمان ہر لحاظ سے زندہ ایمان بن جاتا ہے، جس کے بعد وہ محض ایک خدا کو نہیں، بلکہ ایک ایسی سمیع و بصیر، علیم و حکیم اور قائم بالقسط ہستی کو مانتا ہے جو اُس کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف ہے اور جس کی اطاعت سے وہ کسی حال میں انحراف نہیں کر سکتا۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہی ہے۔

دوسری یہ کہ روزہ اِس احساس کو بھی دل کے اعماق اور روح کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے کہ آدمی کو ایک دن اپنے پروردگار کے حضور میں جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے۔ ماننے کو تو یہ بات ہر مسلمان مانتا ہے، لیکن روزے میں جب پیاس تنگ کرتی، بھوک ستاتی اور جنسی جذبات پوری قوت کے ساتھ اپنی تسکین کا تقاضا کرتے ہیں تو ہر شخص جانتا ہے کہ تنہا یہی احساس جواب دہی ہے جو آدمی کو بطن و فرج کے اِن مطالبات کو پورا کرنے سے روک دیتا ہے۔ رمضان کا پورا

مہینا ہر روز گھنٹوں وہ نفس کے اِن بنیادی تقاضوں پر محض اِس لیے پہرا لگائے رکھتا ہے کہ اُسے ایک دن اپنے مالک کو منہ دکھانا ہے۔ یہاں تک کہ سخت گرمی کی حالت میں حلق پیاس سے چٹختا ہے، برفاب سامنے ہوتا ہے، وہ چاہے تو آسانی سے پی سکتا ہے، مگر نہیں پیتا؛ بھوک کے مارے جان نکل رہی ہوتی ہے، کھانا موجود ہوتا ہے، مگر نہیں کھاتا؛ میاں بیوی جوان ہیں، تنہائی میسر ہے، چاہیں تو اپنی خواہش پوری کر سکتے ہیں، مگر نہیں کرتے۔ یہ ریاضت کوئی معمولی ریاضت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جواب دہی کا احساس اِس سے دل و دماغ میں پوری طرح راسخ ہو جاتا ہے۔ تقویٰ پیدا کرنے کے لیے، اگر غور کیجیے تو دوسری موثر ترین چیز یہی ہے۔

تیسری یہ کہ تقویٰ کے لیے صبر ضروری ہے، اور روزہ انسان کو صبر کی تربیت دیتا ہے۔ بلکہ صبر کی تربیت کے لیے اِس سے بہتر اور اِس سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ شاید نہیں ہو سکتا۔ دنیا میں ہم جس امتحان سے دوچار ہیں، اُس کی حقیقت اِس کے سوا کیا ہے کہ ایک طرف ہمارے حیوانی وجود کی منہ زور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم اُس کے حدود میں رہ کر زندگی بسر کریں؟ یہ چیز قدم قدم پر صبر کا تقاضا کرتی ہے۔ سچائی، دیانت، تحمل، بردباری، عہد کی پابندی، عدل و انصاف، عفو و درگذر، منکرات سے گریز، فواحش سے اجتناب اور حق پر استقامت کے اوصاف نہ ہوں تو تقویٰ کے کوئی معنی نہیں ہیں، اور صبر کے بغیر یہ اوصاف، ظاہر ہے کہ آدمی میں کسی طرح پیدا نہیں ہو سکتے۔

روزے کا مقصد یہی تقویٰ ہے اور اِس کے لیے اللہ نے رمضان کا مہینا مقرر فرمایا ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اِس کی وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ اِس مہینے میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا ہے۔ روزے کے مقصد سے اِس کا کیا تعلق ہے؟ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت میں لکھا ہے:

> ”غور کرنے والے کو اِس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں پیش آ سکتی کہ خدا کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت عقل ہے اور عقل سے بھی بڑی نعمت قرآن ہے، اِس لیے کہ عقل کو بھی حقیقی رہنمائی قرآن ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو عقل سائنس کی ساری دوربینیں اور خردبینیں لگا کر بھی اندھیرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔ اِس وجہ سے جس مہینے میں دنیا کو یہ نعمت ملی، وہ سزاوار تھا کہ وہ خدا کی تکبیر اور اُس کی شکر گزاری کا خاص مہینا ٹھیرا دیا جائے

تاکہ اِس نعمت عظمیٰ کی قدر و عظمت کا اعتراف ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے۔ اِس شکر گزاری اور تکبیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے روزوں کی عبادت مقرر فرمائی جو اُس تقویٰ کی تربیت کی خاص عبادت ہے جس پر تمام دین و شریعت کے قیام و بقا کا انحصار ہے، اور جس کے حاملین ہی کے لیے در حقیقت قرآن ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔... گویا اِس حکمت قرآنی کی ترتیب یوں ہوئی کہ قرآن حکیم کا حقیقی فیض صرف اُن لوگوں کے لیے خاص ہے جن کے اندر تقویٰ کی روح ہو اور اِس تقویٰ کی تربیت کا خاص ذریعہ روزے کی عبادت ہے۔ اِس وجہ سے رب کریم و حکیم نے اِس مہینے کو روزوں کے لیے خاص فرما دیا جس میں قرآن کا نزول ہوا۔ دوسرے لفظوں میں اِس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن اِس دنیا کے لیے بہار ہے اور رمضان کا مہینا موسم بہار اور یہ موسم بہار جس فصل کو نشو و نما بخشتا ہے، وہ تقویٰ کی فصل ہے۔'' (تدبر قرآن 1 / 451)

یہ مقصد روزے سے لازماً حاصل ہوتا ہے، لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ روزہ رکھنے والے اُن خرابیوں سے بچیں جو اگر روزے کو لاحق ہو جائیں تو اُس کی تمام برکتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ خرابیاں اگرچہ بہت سی ہیں، مگر اِن میں سے بعض ایسی ہیں کہ ہر روزے دار کو اُن کے بارے میں ہوشیار رہنا چاہیے۔

اُن میں سے ایک خرابی یہ ہے کہ لوگ رمضان کو لذتوں اور چٹخاروں کا مہینا بنا لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اِس مہینے میں جو خرچ بھی کیا جائے، اُس کا اللہ کے ہاں کوئی حساب نہیں ہے۔ چنانچہ اِس طرح کے لوگ اگر کچھ کھاتے پیتے بھی ہوں تو اُن کے لیے یہ پھر مزے اڑانے اور بہار لوٹنے کا مہینا ہے۔ وہ اِس کو نفس کی تربیت کے بجاے اُس کی پرورش کا مہینا بنا لیتے ہیں اور ہر روز افطار کی تیاریوں ہی میں صبح کو شام کرتے ہیں۔ وہ جتنا وقت روزے سے ہوتے ہیں، یہی سوچتے ہیں کہ سارے دن کی بھوک پیاس سے جو خلا اُن کے پیٹ میں پیدا ہوا ہے، اُسے وہ اب کن کن نعمتوں سے بھریں گے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اول تو روزے سے وہ کچھ پاتے ہی نہیں، اور اگر کچھ پاتے ہیں تو اُسے وہیں کھو دیتے ہیں۔

اِس خرابی سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر کام کی قوت کو باقی رکھنے کے لیے کھائے پیے تو ضرور، لیکن اُس کو جینے کا مقصد نہ بنا لے۔ جو کچھ بغیر کسی اہتمام کے مل جائے، اُس کو اللہ کا شکر کرتے ہوئے کھا لے۔ گھر والے جو کچھ دستر خوان پر رکھ دیں، وہ اگر دل کو نہ بھی بھائے تو

اُس پر خفا نہ ہو۔ اللہ نے اگر مال و دولت سے نوازا ہے تو اپنے نفس کو پالنے کے بجاے اُسے غریبوں اور فقیروں کی مدد اور اُن کے کھانے پلانے پر خرچ کرے۔ یہ چیز یقیناً اُس کے روزے کی برکتوں کو بڑھائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ انفاق کے معاملے میں یہی ہے۔ سیدنا عبد اللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور عام حالات میں بھی سب سے زیادہ فیاض تھے، لیکن رمضان میں تو گویا سراپا جود و کرم بن جاتے تھے۔[9]

دوسری خرابی یہ ہے کہ بھوک اور پیاس کی حالت میں چونکہ طبیعت میں کچھ تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اِس وجہ سے بعض لوگ روزے کو اُس کی اصلاح کا ذریعہ بنانے کے بجاے، اُسے بھڑکانے کا بہانہ بنا لیتے ہیں۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے نیچے کام کرنے والوں پر ذرا ذرا سی بات پر برس پڑتے، جو منہ میں آیا، کہہ گزرتے، بلکہ بات بڑھ جائے تو گالیوں کا جھاڑ باندھ دیتے ہیں، اور بعض حالتوں میں اپنے زیر دستوں کو مارنے پیٹنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اِس کے بعد وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ روزے میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

اِس کا علاج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ آدمی اِس طرح کے موقعوں پر روزے کو اشتعال کا بہانہ بنانے کے بجاے اُس کے مقابلے میں ایک ڈھال کی طرح استعمال کرے، اور جہاں اشتعال کا کوئی موقع پیدا ہو، فوراً یاد کرے کہ میں روزے سے ہوں۔ آپ کا ارشاد ہے: روزے ڈھال ہیں، لہٰذا تم میں سے جس شخص کا روزہ ہو، وہ نہ بے حیائی کی باتیں کرے، اور نہ جہالت دکھائے۔ پھر اگر کوئی گالی دے یا لڑنا چاہے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں، میرے بھائی میں روزے سے ہوں۔[10] چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ روزہ رکھنے والا اگر غصے اور اشتعال کے ہر موقع پر یاددہانی کا یہ طریقہ اختیار کرے گا تو آہستہ آہستہ دیکھے گا کہ اُس نے اپنے نفس کے شیطان پر اتنا قابو پا لیا ہے کہ وہ اب اُسے گرا لینے میں کم ہی کامیاب ہوتا ہے۔ شیطان کے مقابلے میں فتح کا یہ احساس اُس کے دل میں اطمینان اور برتری کا احساس پیدا کرے گا اور روزے کی یہی یاددہانی اُس کی اصلاح کا ذریعہ بن جائے گی۔ پھر وہ وہیں غصہ کرے گا، جہاں اُس کا

---

[9] ۔ بخاری، رقم 6۔ مسلم، رقم 6009۔

[10] ۔ بخاری، رقم 1894۔ مسلم، رقم 2703۔

موقع ہو گا۔ وقت بے وقت اُسے مشتعل کر دینا کسی کے لیے ممکن نہ رہے گا۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ بہت سے لوگ جب روزے میں کھانے پینے اور اِس طرح کی دوسری دل چسپیوں کو چھوڑتے ہیں تو اپنی اِس محرومی کا مداوا اُن دل چسپیوں میں ڈھونڈنے لگتے ہیں جن سے اُن کے خیال میں روزے کو کچھ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بہل جاتا ہے۔ وہ روزہ رکھ کر تاش کھیلیں گے، ناول اور افسانے پڑھیں گے، نغمے اور غزلیں سنیں گے، فلمیں دیکھیں گے، دوستوں میں بیٹھ کر گپ ہانکیں گے اور اگر یہ سب نہ کریں گے تو کسی کی غیبت اور ہجو ہی میں لپٹ جائیں گے۔ روزے میں پیٹ خالی ہو تو آدمی کو اپنے بھائیوں کا گوشت کھانے میں ویسے بھی بڑی لذت ملتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات صبح اِس مشغلے میں پڑتے ہیں اور پھر موذن کی اذان کے ساتھ ہی اِس سے ہاتھ کھینچتے ہیں۔

اِس خرابی کا ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی خاموشی کو روزے کا ادب سمجھے اور کوشش کرے کہ کم سے کم اناپ شناپ کہنے اور جھوٹی سچی اڑانے کے معاملے میں تو اُس کی زبان پر تالا لگا رہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جو شخص جھوٹ بولنا اور اُس پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ کو اِس کی کچھ ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔[11]

اِس کا دوسرا علاج یہ ہے کہ جو وقت ضروری کاموں سے بچے، اُس میں آدمی قرآن و حدیث کا مطالعہ کرے اور دین کو سمجھے۔ وہ روزے کی اِس فرصت کو غنیمت جان کر اِس میں قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعاؤں کا کچھ حصہ یاد کر لے۔ اِس طرح وہ روزے میں اُن مشغلوں سے بچے گا اور بعد میں یہی ذخیرہ اللہ کی یاد کو اُس کے دل میں قائم رکھنے کے لیے اُس کے کام آئے گا۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ آدمی بعض اوقات روزہ اللہ کے لیے نہیں، بلکہ اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کی ملامت سے بچنے کے لیے رکھتا ہے اور کبھی لوگوں میں اپنی دین داری کا بھرم قائم رکھنے کے لیے یہ مشقت جھیلتا ہے۔ یہ چیز بھی روزے کو روزہ نہیں رہنے دیتی۔

اِس کا علاج یہ ہے کہ آدمی روزے کی اہمیت ہمیشہ اپنے نفس کے سامنے واضح کرتا رہے اور اُسے تلقین کرے کہ جب کھانا پینا اور دوسری لذتیں چھوڑ ہی رہے ہو تو پھر اللہ کے لیے کیوں

---

[11]۔ بخاری، رقم 1903۔

نہیں چھوڑتے۔ اِس کے ساتھ رمضان کے علاوہ کبھی کبھی نفلی روزے بھی رکھے اور اُنھیں زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرے۔ اِس سے امید ہے کہ اُس کے یہ فرض روزے بھی کسی وقت اللہ ہی کے لیے خالص ہو جائیں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نفل روزے خود رکھے ہیں یا لوگوں کو اِسی مقصد سے اُن کے رکھنے کی ترغیب دی ہے، وہ یہ ہیں:

یوم عاشور کا روزہ

روایتوں میں اِس کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔[12] آپ بالعموم اِس کا اہتمام کرتے تھے،[13] بلکہ رمضان کے روزوں سے پہلے تو یہ روزہ آپ لازماً رکھتے اور لوگوں کو بھی اِس کا حکم دیتے، اِس پر ابھارتے اور اِس معاملے میں اُن پر نگران رہتے تھے۔[14] اِس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قریش یہ روزہ رکھتے تھے[15] اور ایک یہ بیان کی گئی ہے کہ یہود اِس دن کا روزہ رکھتے تھے۔ حضور نے پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ یہ دن اُن کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ موسیٰ اور اُن کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اِس دن نجات عطا فرمائی اور فرعون اور اُس کی قوم کو دریا میں غرق کر دیا، تب موسیٰ علیہ السلام نے اِس پر شکرانے کا روزہ رکھا تھا۔ حضور نے فرمایا: موسیٰ سے ہمارا تعلق تم سے زیادہ ہے۔ چنانچہ آپ نے بھی روزہ رکھا اور لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی۔[16]

یوم عرفہ کا روزہ

اِس دن کی فضیلت ہر مسلمان کو معلوم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِس

---

[12]۔ بخاری، رقم 2004۔ مسلم، رقم 2746۔

[13]۔ بخاری، رقم 2006۔ مسلم، رقم 2637۔

[14]۔ بخاری، رقم 2002، 4680۔ مسلم، رقم 2652۔

[15]۔ بخاری، رقم 2002۔ مسلم، رقم 2637، 2642۔

[16]۔ بخاری، رقم 2004۔ مسلم، رقم 2658۔

میں روزہ رکھا جائے تو اِس کے صلے میں توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک سال پہلے اور ایک سال بعد کے گناہ بخش دیں گے۔[17] تاہم حج کے موقع پر آپ نے یہ روزہ نہیں رکھا۔[18] اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ حج کی مشقت کے ساتھ آپ نے اِسے جمع کرنا پسند نہیں فرمایا۔

شوال کے روزے

اِن روزوں کی فضیلت بھی روایتوں میں بیان ہوئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس نے رمضان کے روزے رکھے، پھر اُن کے متصل بعد شوال کے چھ روزے رکھ لیے، وہ گویا عمر بھر روزے سے رہا۔[19]

ہر مہینے میں تین روزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کی ترغیب دی اور اِن کے بارے میں وہی بات فرمائی ہے جو اوپر شوال کے روزوں کے بارے میں بیان ہوئی ہے۔[20] سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ حضور خود بھی یہ روزے رکھتے تھے۔ تاہم اِن کے لیے کوئی دن متعین نہیں تھے۔ آپ جب چاہتے، پورے مہینے میں کسی وقت یہ روزے رکھ لیتے تھے۔[21] بعض صحابہ کو، البتہ آپ نے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ چاند کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخ کو یہ روزے رکھیں۔[22]

---

[17] ۔ مسلم، رقم 2746۔ یعنی وہ گناہ جو حقوق العباد سے متعلق نہیں ہیں یا جن کے لیے توبہ اور تلافی کرنا یا کفارہ ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔

[18] ۔ بخاری، رقم 1658، 1988۔ مسلم، رقم 2632۔

[19] ۔ مسلم، رقم 2758۔ ابوداؤد، رقم 2433۔

[20] ۔ بخاری، رقم 1976، 1979۔ مسلم، رقم 2746۔

[21] ۔ مسلم، رقم 2744۔

[22] ۔ نسائی، رقم 2422۔

پیر اور جمعرات کا روزہ

حضور نے یہ روزے بھی رکھے ہیں۔ لوگوں نے اِس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن لوگوں کے اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔[23] نیز فرمایا کہ پیر کا دن میری پیدایش کا دن ہے اور مجھ پر قرآن کا نزول بھی اِسی دن ہوا تھا۔[24]

شعبان کے روزے

رمضان کے علاوہ یہی مہینا ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر روزے سے رہتے تھے۔ سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ میں نے شعبان سے زیادہ آپ کو کسی مہینے میں روزے رکھتے ہوئے نہیں دیکھا۔[25]

اِن کے علاوہ بھی لوگ جب چاہیں، نفل روزے رکھ سکتے ہیں۔ زیادہ روزوں کی خواہش رکھنے والوں کو آپ نے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ اِس معاملے میں سیدنا داؤد علیہ السلام کی پیروی کریں جو ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن چھوڑ دیتے تھے۔[26] تنہا جمعہ کو روزے کے لیے خاص کر لینے،[27] پورا سال روزے رکھنے[28] اور عید کے دنوں میں روزہ رکھنے کو،[29] البتہ آپ نے پسند نہیں فرمایا۔[30]

---

[23] ۔ نسائی، رقم 2360۔ احمد، رقم 21246۔

[24] ۔ مسلم، رقم 2747۔

[25] ۔ بخاری، رقم 1969، 1970۔ مسلم، رقم 2721، 2722۔

[26] ۔ بخاری، رقم 1979۔ مسلم، رقم 2729۔

[27] ۔ بخاری، رقم 1984، 1985۔ مسلم، رقم 2681، 2683، 2684۔

[28] ۔ بخاری، رقم 1976۔ مسلم، رقم 2747۔

[29] ۔ بخاری، رقم 1990، 1991۔ مسلم، رقم 2671، 2672۔

[30] ۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی چیز تھوڑے ہی عرصے میں بدعت بن جاتی، دوسری زندگی کا توازن درہم برہم کر دیتی اور تیسری بالکل بے محل ہوتی جس کے لیے اِس دین قیم میں ہرگز کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی۔

روزے کا قانون

انبیا علیہم السلام کے دین میں روزے کا جو قانون ہمیشہ سے رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اُسی کے مطابق روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایمان والوں پر روزہ اُسی طرح فرض کیا گیا ہے، جس طرح اُن سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا۔ فرمایا ہے کہ یہ گنتی کے چند دن ہیں جو اِس عبادت کے لیے خاص کیے گئے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ تالیف قلب کے طور پر کہی گئی ہے۔ گویا مدعا یہ ہے کہ روزے کی برکتیں اگر پیش نظر ہوں تو بارہ مہینوں میں 30 یا 29 دن کوئی بڑی مدت نہیں ہے، بلکہ گنتی کے چند دن ہی ہیں، لہٰذا گھبرانے یا دل شکستہ ہونے کے بجاے آدمی کو اِن سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اِس تمہید کے بعد رخصت کا حکم بیان ہوا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے کہ جو لوگ بیماری یا سفر کی وجہ سے رمضان کے روزے پورے نہ کر سکیں، وہ دوسرے دنوں میں یا تو روزے رکھ کر یہ تعداد پوری کر لیں، یا ایک روزے کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر چھوڑے ہوئے روزوں کی تلافی کریں۔ اِس حکم کا خاتمہ اِن الفاظ پر ہوا ہے: ’فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ، وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّكُمۡ، اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ‘ (پھر جو شوق سے کوئی نیکی کرے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے اور روزہ رکھ لو تو یہ تمھارے لیے اور بھی اچھا ہے، اگر تم سمجھتے ہو)۔ مطلب یہ ہے کہ روزے کا یہ فدیہ کم سے کم مطالبہ ہے جو استطاعت رکھنے والوں کو ہر حال میں پورا کرنا چاہیے، لیکن اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا اُن کے ساتھ کوئی اور نیکی کر دے تو یہ اُس کے لیے بہتر ہے۔ پھر اللہ کے نزدیک اِس سے بھی بہتر یہ ہے کہ آدمی فدیے کے بجاے دوسرے دنوں میں روزے ہی پورے کرے۔

تاہم اِس کے بعد جو آیت ’شَهۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ فِیۡهِ الۡقُرۡاٰنُ‘ کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے، اُس میں فدیے کی اجازت ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ حکم کو بعینہٖ دہرا کر اُس میں سے ’وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ‘ سے ’اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ‘ تک کے الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ رمضان کے بعد عام دنوں میں روزہ رکھنا چونکہ مشکل ہوتا ہے، اِس لیے جب تک طبائع اِس کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہو گئیں، اللہ تعالیٰ نے اِسے لازم نہیں کیا۔ چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ فدیے کی یہ

اجازت اِس لیے ختم کر دی گئی ہے کہ تم روزوں کی تعداد پوری کرو اور جو خیر و برکت اُس میں چھپی ہوئی ہے، اُس سے محروم نہ رہو۔

روزے کا حکم اصلاً یہی ہے۔ اِس کے بعد، معلوم ہوتا ہے کہ بعض سوالات لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوئے۔ اِن میں سے ایک اہم سوال یہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں بیویوں کے پاس جانا جائز ہے یا نہیں؟ اِس کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے معاً بعد پھر شروع ہو جاتا تھا اور وہ روزے کی رات میں کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مسلمانوں نے اِس سے گمان کیا کہ اُن کے لیے بھی یہی قانون ہو گا، لیکن پھر اُن میں سے بعض لوگ یہ گمان اپنے دلوں میں رکھتے ہوئے اِس کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ یہ کوئی اچھی بات نہ تھی، اِس لیے کہ آدمی اگر اپنے اجتہاد یا گمان کے مطابق کسی چیز کو دین و شریعت کا تقاضا سمجھتا ہے تو اِس سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم ہے یا نہیں، اُس کی خلاف ورزی اُس کے لیے جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے اِسے ضمیر کے ساتھ خیانت سے تعبیر کیا اور وضاحت فرمائی:

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ، هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ، عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ. فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ، ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ، وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ. تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ.

(البقرہ 2:187)

”(تم پوچھنا چاہتے ہو تو لو ہم بتائے دیتے ہیں کہ) روزوں کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمھارے لیے جائز کیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اُس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے درگذر کیا۔ چنانچہ اب (بغیر کسی تردد کے) اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اور (اِس کا) جو (نتیجہ) اللہ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے، اُسے چاہو، اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ رات کی سیاہ دھاری سے فجر کی سفید دھاری تمھارے لیے بالکل نمایاں ہو جائے۔ پھر رات تک اپنا روزہ پورا کرو۔

اور ہاں، تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو
(رات کو بھی) بیویوں کے پاس نہ جانا۔ یہ
اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں، سو اِن کے
قریب نہ جاؤ۔ اللہ اِسی طرح اپنی آیتیں
لوگوں کے لیے واضح کرتا ہے تاکہ وہ
تقویٰ اختیار کریں۔‘‘

قرآن کی اِس وضاحت کے بعد روزے اور اعتکاف کا جو قانون متعین ہو کر سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے:

روزے کی نیت سے اور محض اللہ کی خوشنودی کے لیے کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے سے اجتناب ہی شریعت کی اصطلاح میں روزہ ہے۔

یہ پابندی فجر سے لے کر رات کے شروع ہونے تک ہے، لہٰذا روزے کی راتوں میں کھانا پینا اور بیویوں کے پاس جانا بالکل جائز ہے۔

روزوں کے لیے رمضان کا مہینا خاص کیا گیا ہے، اِس لیے جو شخص اِس مہینے میں موجود ہو، اُس پر فرض ہے کہ اِس پورے مہینے کے روزے رکھے۔

بیماری یا سفر کی وجہ سے یا کسی اور مجبوری کے باعث آدمی اگر رمضان کے روزے پورے نہ کر سکے تو لازم ہے کہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر اُس کی تلافی کرے اور یہ تعداد پوری کر دے۔

حیض و نفاس کی حالت میں روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ تاہم اِس طرح چھوڑے ہوئے روزے بھی بعد میں لازماً پورے کیے جائیں گے۔

روزے کا منتہاے کمال اعتکاف ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر کسی شخص کو اِس کی توفیق دے تو اُسے چاہیے کہ روزوں کے مہینے میں جتنے دنوں کے لیے ممکن ہو، دنیا سے الگ ہو کر اللہ کی عبادت کے لیے مسجد میں گوشہ نشین ہو جائے اور بغیر کسی ناگزیر انسانی ضرورت کے مسجد سے باہر نہ نکلے۔

آدمی اعتکاف کے لیے بیٹھا ہو تو روزے کی راتوں میں کھانے پینے پر تو کوئی پابندی نہیں ہے، لیکن بیویوں کے پاس جانا اُس کے لیے جائز نہیں رہتا۔ اعتکاف کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے اِسے ممنوع قرار دیا ہے۔

روزے کا یہ قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ثابت ہے اور قرآن مجید نے بھی بڑی حد تک اِس کی تفصیل کر دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و عمل سے اِس کی جو توضیحات ہوئی ہیں، وہ ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ہم ذیل میں بیان کیے دیتے ہیں:

1۔ چاند نظر آ جائے تو مہینا شروع کر لینا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: مہینا انتیس دن کا بھی ہو سکتا ہے، اِس لیے چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور دیکھ لو تو افطار کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کر لو۔[31]

2۔ رمضان کے شروع ہونے سے ایک یا دو دن پہلے روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے پسند نہیں کیا اور فرمایا ہے کہ وہ شخص، البتہ اِس سے مستثنیٰ ہے جو اِس دن روزہ رکھتا ہو۔[32]

3۔ سحری کے لیے اٹھنا چاہیے۔ فرمایا ہے کہ سحری کھایا کرو، اِس لیے کہ سحری کھانے میں برکت ہے۔[33]

4۔ روزے میں مجامعت کے سوا بیوی سے ہر طرح اظہار محبت کر سکتے ہیں۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روزے کی حالت میں بوسہ لیتے اور مجھے اپنے ساتھ بھی لگاتے تھے۔[34]

5۔ جنابت کی حالت میں روزہ رکھ سکتے ہیں۔ سیدہ ہی کی روایت ہے کہ حضور بھی بعض اوقات روزہ رکھ لیتے اور فجر کے بعد ہی غسل جنابت کرتے تھے۔[35]

6۔ آدمی بھول کر کچھ کھا لے تو اِس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ فرمایا ہے کہ یہ تو اُسے اللہ نے

---

[31] ۔ مسلم، رقم 2503، 2514۔ مطلب یہ ہے کہ اصل چیز چاند دیکھنا نہیں، بلکہ مہینے کی ابتدا یا خاتمے کا علم ہے، وہ جس طریقے سے بھی ہو جائے، اُسی کے مطابق روزہ رکھو یا افطار کرو۔

[32] ۔ بخاری، رقم 1914۔ مسلم، رقم 2518۔

[33] ۔ بخاری، رقم 1923۔ مسلم، رقم 2549۔

[34] ۔ بخاری، رقم 1927۔ مسلم، رقم 2576۔

[35] ۔ بخاری، رقم 1931۔ مسلم، رقم 2589۔

کھلایا اور پلایا ہے۔[36]

7۔ اعتکاف رمضان کے دوسرے یا تیسرے عشرے میں اور پورے دس دن کے لیے کیا جائے تو بہتر ہے، الّا یہ کہ مہینا انتیس کا ہو۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بالعموم یہی تھا۔[37]

8۔ جان بوجھ کر روزہ توڑ لینا ایک بڑا گناہ ہے۔ اِس طرح کی کوئی چیز آدمی سے سرزد ہو جائے تو بہتر ہے کہ وہ اِس کا کفارہ ادا کرے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے لیے ایک شخص کو وہی کفارہ بتایا جو قرآن مجید نے ظہار کے لیے مقرر کیا ہے۔ تاہم روایت سے واضح ہے کہ جب اُس نے معذوری ظاہر کی تو آپ نے اِس پر اصرار نہیں فرمایا۔[38]

---

[36]۔ بخاری، رقم 1933۔ مسلم، رقم 2716۔

[37]۔ بخاری، رقم 2025۔2027۔ مسلم، رقم 2772، 2780۔

[38]۔ بخاری، رقم 1936۔ مسلم، رقم 2595۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ کفارہ اُسی وقت واجب ہوتا ہے، جب 'یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا' جیسی کوئی ضرورت پیش آ جائے۔

سید منظور الحسن

اخلاقیات کی پانچ حرمتیں

سورۂ اعراف (7) کی آیت 33 سے واضح ہے کہ اخلاقیات کے دائرے میں شریعت نے کل پانچ چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے۔ ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ.

”کہہ دو، میرے پروردگار نے تو صرف فواحش کو حرام کیا ہے، خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اِس کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراؤ، جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور اِس کو کہ تم اللہ پر افترا کر کے کوئی ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔“

یہ پانچ چیزیں فواحش، حق تلفی، ناحق زیادتی، شرک اور اللہ پر جھوٹ باندھنا ہیں۔ ”فواحش“ سے مراد وہ کام ہیں، جنھیں انسانی فطرت برائی سمجھتی ہے اور انسانوں کا اجتماعی ضمیر جن کی شناعت پر متفق ہے۔ زنا، اغلام، وطی بہائم اور اِن جیسے جنسی بے راہ روی کے کام اِن میں نمایاں ہیں۔ ”حق تلفی“ سے مراد وہ عمل ہے، جس کے نتیجے میں حق دار حق سے محروم ہو جائے یا مستحق کا استحقاق مجروح ہو جائے۔ یہی وہ مفہوم ہے، جس کے لیے آیت میں ’الْاِثْمَ‘ کا لفظ آیا ہے۔ ”ناحق زیادتی“ یہ

ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق میں مداخلت کرے یا اُن کی بجا آوری سے انحراف کا رویہ اختیار کرے۔ اِسی سے ظلم و زیادتی، سرکشی و بغاوت اور ضد اور ہٹ دھرمی کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔

''شرک'' یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات یا اُس کی تدبیرِ امور میں کسی کو حصہ دار سمجھا جائے۔ اللہ پر جھوٹ باندھنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول کی سند کے بغیر کسی بات کو دین کے طور پر پیش کیا جائے۔ اِسی کو اصطلاح میں ''بدعت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حکم کے آغاز میں 'اِنَّمَا' (صرف) کا کلمۂ حصر اِس امر پر دلیل قاطع کی حیثیت رکھتا ہے کہ اِن میں نہ کسی چیز کا اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ کمی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا قرآن و حدیث میں مذکور تمام اخلاقی حرمتوں کو اِنھی پانچ حرمتوں کے ذیل میں شمار کیا جائے گا۔ استاذِ گرامی نے لکھا ہے:

''... کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اللہ نے صرف پانچ چیزیں حرام قرار دی ہیں: ایک فواحش، دوسرے حق تلفی، تیسرے ناحق زیادتی، چوتھے شرک اور پانچویں بدعت۔ خدا کی شریعت میں یہی پانچ چیزیں حرام ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ حلال و حرام کے معاملے میں یہ خدا کا اعلان ہے، لہٰذا کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اِن کے علاوہ کسی چیز کو حرام ٹھیرائے۔ چنانچہ اب اگر کوئی چیز حرام ہو گی تو اُسی وقت ہو گی، جب اِن میں سے کوئی چیز اُس میں پائی جائے گی۔ روایتیں، آثار، حدیثیں اور پچھلے صحیفوں کے بیانات، سب قرآن کے اِسی ارشاد کی روشنی میں سمجھے جائیں گے۔ اِس سے ہٹ کر یا اِس کے خلاف کوئی چیز بھی قابل قبول نہ ہو گی۔''(البیان 2/150-151)

اِن حرمتوں کے فہم اور اطلاق کے حوالے سے چند باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے:

ایک یہ کہ فواحش، حق تلفی، ناحق زیادتی، شرک اور افترا علی اللہ کے الفاظ ہی سے واضح ہے کہ یہ مفرد اور متعین جرائم نہیں ہیں۔ یہ اُن کے کلیات یا اصولی انواع ہیں۔ اِن میں ہر ایک کے تحت کثیر مجرمانہ اعمال شمار ہو سکتے ہیں۔ ہر نوع شناعت کا الگ پہلو رکھتی ہے۔ شناعت کے یہی پہلو وہ علتیں یا حقیقتیں ہیں، جو اصلاً حرام ہیں۔ چنانچہ یہ جب کسی عمل میں شامل ہوتے ہیں تو اُسے محرمات کے دائرے میں داخل کر دیتے ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً متعین ہونا اور بہ طورِ اصول واضح ہونا ضروری ہے تاکہ لوگ اِنھیں الگ الگ پہچان سکیں اور اِن کی شناعت کی حقیقت سے آگاہ ہو کر مختلف اعمال پر اِن کا اطلاق کر سکیں۔

دوسرے یہ کہ بعض جرائم ایسے ہوسکتے ہیں، جو اِن میں سے مختلف انواع کے تحت بہ یک وقت شمار ہو سکیں۔ یہ چیز درجہ بندی میں مانع نہیں ہے۔ ایسے مرکب جرائم اپنے نتائج واثرات کے اعتبار سے زیادہ سنگین متصور ہوں گے۔ اِس کی سب سے نمایاں مثال شرک کا بدترین جرم ہے۔ یہ افترا علی اللہ ہے اور بہ یک وقت حق تلفی اور ناحق زیادتی کے تحت آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اِن دونوں پہلوؤں سے قابلِ مواخذہ ہو گا۔ مزید برآں، ایسے جرائم ہوسکتے ہیں، جو فواحش، حق تلفی اور ناحق زیادتی، تینوں نوعیتوں کا مجموعہ ہوں۔ اِس کی مثال قحبہ گری اور زنا بالجبر ہے۔ اِس طرح کے جرائم میں متعلقہ انواع کی انفرادیت پوری طرح قابلِ فہم ہوتی ہے اور جرم کی سنگینی میں اضافے کا باعث ہوتی ہے۔

تیسرے یہ کہ دین کے اوامر، جنھیں مثبت طور پر بجالانے کا حکم دیا گیا ہے، اُن سے انحراف بھی من جملہ منکرات ہے اور عند اللہ قابلِ مواخذہ ہے، مگر اُنھیں محرمات اور منہیات میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ عبادات اور اخلاقیات کے تمام ایجابی احکام کی پیروی دین کا مطلوب ہے۔ یہ اوامر میں شمار ہوں گے، اِنھیں نواہی میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ حرام چیزوں کا تعلق نواہی سے ہے، اُنھیں اوامر میں شمار کر کے خلطِ مبحث پیدا نہیں کرنا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ ایجابی احکام سے متعلق ممنوعات ایجابی احکام ہی کا جزو ہوتے ہیں، اُنھیں الگ سے محرمات میں شامل نہیں کیا جاتا۔ مثلاً نشے یا جنابت یا حیض و نفاس کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعتیں حرمتیں نہیں ہیں، نماز کی شرطیں ہیں۔ اِسی طرح سورج کے طلوع وغروب کے اوقات کو نماز پڑھنے کے ممنوع اوقات کہا جاتا ہے، منہیات میں شمار نہیں کیا جاتا۔ روزے میں کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے سے اجتناب کو بھی حرام کے دائرے میں نہیں سمجھا جاتا، کیونکہ یہ اجتناب ہی تو اصل میں روزہ ہے۔ مزید یہ کہ اگر کوئی شخص دین کے فرائض ـــ نماز، روزہ، زکوٰۃ ـــ کو ادا کرنے سے روگردانی کرتا ہے تو اُسے اُن کا منکر یا تارک کہا جائے گا، حرام کار نہیں کہا جائے گا۔

پانچویں یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ فرمودات جو آداب کی نوعیت کے ہیں اور جن میں ادباً، تادیباً یا تنبیہاً مختلف چیزوں سے روکا گیا ہے، وہ بھی حرمتوں میں شامل نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ مائدہ (5) کی آیت 101 میں فرمایا ہے: ’یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ‘ (ایمان والو، ایسی باتیں نہ پوچھا کرو، جو اگر تم پر ظاہر کر

دی جائیں تو تمھیں گراں ہوں)۔ سورۂ بقرہ (2) کی آیت 154 میں ارشاد ہے: ’وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ‘ (اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، اُنھیں یہ نہ کہو کہ مردہ ہیں)۔ سورۂ انعام (6) کی آیت 108 میں ہے: ’وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ‘ (تم لوگ اُنھیں گالی نہ دو، جن کو اللہ کے سوا یہ پکارتے ہیں)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز کے دوران میں تھوکنے سے منع کرنا، تین لوگوں میں سے دو کو سرگوشی کرنے سے روکنا، تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھنے کی ممانعت فرمانا اِسی نوعیت کے احکام ہیں، چنانچہ اِن کے لیے حرام کی اصطلاح اختیار نہیں کی جائے گی۔

چھٹے یہ کہ قرآن وحدیث میں ممانعت کے لیے جو اسالیب، مثلاً ’لا‘، ’نھی‘، ’حرم‘، ’لا یحل‘، ’اجتنبوا‘ وغیرہ استعمال ہوتے ہیں، اِن سے قطعی حرمت کا حکم اخذ کرنا لازم نہیں ہے۔ اِن میں سے بعض محض تنبیہ کی غرض سے، بعض تہذیبِ اخلاق کے لیے، بعض سدِ ذریعہ کے طور پر اور بعض قطعی حرمت کے لیے آتے ہیں۔ اِن کے منشا کا تعین معاملے کی نوعیت اور دین کے عرف کی بنا پر کیا جاتا ہے۔[1]

1۔ ہمارے فقہا نے اِس تفریق کو واضح کرنے کے لیے ’حرام لذاتہٖ‘، ’حرام لغیرہٖ‘، ’مکروہ تحریمی‘ اور ’مکروہ تنزیہی‘ جیسی اصطلاحات وضع کی ہیں۔

محمد حسن الیاس

عورت کی تادیب — مخاطب شوہر یا معاشرہ؟

قرآن مجید کے طرزِ خطاب کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اگرچہ اس کا خطاب پیغمبر کی زبانی پوری سوسائٹی سے ہوتا ہے، لیکن عملی ہدایات ہمیشہ ان کرداروں سے متعلق ہوتی ہیں جو سیاقِ کلام میں واضح طور پر زیرِ بحث ہوں۔ عمومی خطاب حکم کے عموم کی دلیل نہیں بنتا؛ اصل ذمہ داری کا تعین ہمیشہ ہدایات کی نوعیت اور ان کرداروں سے ہوتا ہے جنھیں سیاق وسباق نمایاں کر دیتے ہیں۔

یہی حقیقت قرآن کی متعدد آیات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یتیموں کے بارے میں فرمایا کہ ”اگر تمھیں خوف ہو کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو (النساء 3:4)۔

یہاں خطاب عام ہے، مگر حکم صرف ان لوگوں کے لیے ہے، جو یتیموں کے سرپرست ہیں۔

اسی طرح رضاعت کے احکام میں بھی خطاب اجتماعی ہے، لیکن ذمہ داری صرف ماں اور باپ پر عائد کی گئی ہے۔ پوری سوسائٹی نہ بچوں کو دودھ پلا سکتی ہے اور نہ ان کا نان ونفقہ اٹھا سکتی ہے۔

یہ قرآن کے طرزِ بیان کی بنیادی حقیقت ہے کہ خطاب اگرچہ عام ہو، مگر حکم ہمیشہ اس کردار کے مطابق خاص رہتا ہے جسے سیاق نے نمایاں کیا ہو۔ اسی نوعیت کا خطاب سورۂ نساء (4) کی آیت 34 میں بھی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا	”مرد عورتوں کے سربراہ بنائے گئے
فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّ بِمَآ	ہیں، اِس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے
اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ	پر فضیلت بخشی ہے اور اِس لیے کہ اُنھوں
قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ	نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔ پھر جو نیک
وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ	عورتیں ہیں، وہ (اپنے شوہروں کی)

اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا.

فرماں بردار ہوتی ہیں، رازوں کی حفاظت کرتی ہیں، اِس بنا پر کہ اللہ نے بھی رازوں کی حفاظت کی ہے۔ اور (اِسی اصول پر تم کو حق دیا گیا ہے کہ) جن عورتوں سے تمھیں سرکشی کا اندیشہ ہو، اُنھیں نصیحت کرو اور اُن کے بستروں پر اُنھیں تنہا چھوڑ دو اور (اِس پر بھی نہ مانیں تو) اُنھیں سزا دو۔ پھر اگر وہ تمھاری بات ماننے لگیں تو اُن پر الزام کی راہ نہ ڈھونڈو۔ بے شک، اللہ بہت بلند ہے، وہ بہت بڑا ہے۔''

یہاں بھی خطاب بہ ظاہر عام ہے، لیکن سیاقِ کلام مکمل طور پر میاں اور بیوی کے باہمی تعلق، ان کی ذمہ داریوں اور ان کے داخلی نظم پر قائم ہے۔ قوامیت کا ذکر، عورتوں کی ذمہ داریوں کی تعیین، غیب میں ان کی حفاظت، پھر ان ذمہ داریوں میں کوتاہی کی صورت میں اصلاح کے تین مراحل، یہ سب اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ یہاں اصل مخاطب شوہر اور بیوی ہی ہیں، نہ کہ سوسائٹی کے تمام طبقات۔

یہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ خطاب میں جمع کا صیغہ ہے، اس لیے تادیبی مراحل میں مخاطب شوہر کے ساتھ سوسائٹی بھی ہو سکتی ہے۔ الفاظ ہیں: 'وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ'۔ ہمارے نزدیک یہ رائے سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ آیت کی ابتدا سے آخر تک پورا بیان شوہر ہی کے کردار اور اس کی ذمہ داری پر قائم ہے۔

اسی مقام پر قرآن نے خود اس تادیب کو نافذ کرنے والے فریق کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ فیصلہ بھی کر دیا ہے کہ ان ہدایات کا اصل مخاطب کون ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

فَاِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوا عَلَيْهِنَّ سَبِيلًا.

''پھر اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو ان پر کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔''

یہاں 'کُمْ' کی ضمیر شوہر کے سوا کسی پر نہیں جاتی، کیونکہ اطاعت ہمیشہ اسی فریق سے متعلق ہوتی ہے جس کے ساتھ ازدواجی معاہدہ قائم ہو۔ بیوی کی اطاعت شوہر سے متعلق ہے، سوسائٹی

سے نہیں۔ سوسائٹی نہ قوام ہے اور نہ اس کے ساتھ اطاعت یا نافرمانی کا کوئی مفہوم قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ شوہر اور سوسائٹی، دونوں کو بہ یک وقت مخاطب قرار دینا عملی حقیقت اور سیاق وسباق کے مکمل خلاف ہے۔ آیت کی یہ ضمیر پوری قطعیت کے ساتھ بتا دیتی ہے کہ اس ہدایت کے مخاطب صرف اور صرف شوہر ہیں۔

اس مقام پر اس بات کی بھی خاص طور پر وضاحت ضروری ہے کہ ان تین اصلاحی مراحل میں سے دوسرا مرحلہ، یعنی ’وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ‘ کسی بھی پہلو سے سوسائٹی سے متعلق ہدایت ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ ’مَضَاجِع‘ سے مراد لیٹنے کی جگہیں ہیں، یعنی بستر اور خواب گاہیں، اور یہ وہ دائرہ ہے جو فطری، عرفی اور عملی، ہر اعتبار سے صرف اور صرف شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق سے متعلق ہوتا ہے۔ معاشرہ نہ کسی کے بستر میں شریک ہوتا ہے، نہ اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ میاں بیوی کے نجی رہایشی نظم میں مداخلت کرے۔ بستر ترک کرنے کی ہدایت صرف اسی فریق سے متعلق ہو سکتی ہے جس کے ساتھ عورت کا ازدواجی تعلق قائم ہے، جس کے گھر میں وہ رہتی ہے اور جس کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی بسر ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ تعبیر دراصل جنسی تعلق کو ترک کرنے کا ایک استعارہ ہے، جسے قرآن نے اس کی ظاہری اور محسوس صورت میں بیان کر دیا ہے، اور یہ قرآن مجید کا معروف ادبی اسلوب ہے کہ وہ نہایت نازک اور نجی نوعیت کی باتوں کو براہِ راست کے بجاے ایسے ہی باوقار اور اشاراتی پیرایے میں بیان کرتا ہے۔

چنانچہ ’فِي الْمَضَاجِعِ‘ کی قید خود اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں مخاطب سوسائٹی نہیں، بلکہ صرف شوہر ہے، اور اس ہدایت کو کسی اجتماعی یا سماجی تناظر میں منتقل کرنا نہ صرف سیاق کے خلاف ہے، بلکہ عملی حقیقت سے بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ البتہ قرآن نے سوسائٹی کو ازدواجی معاملات میں ایک خاص مقام پر ضرور شامل کیا ہے، اور وہ اس وقت ہے، جب مسئلہ نشوز کے داخلی دائرے سے نکل کر شقاق کے سماجی بحران میں بدل جائے۔ فرمایا:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا.... ”اور اگر تمھیں دونوں کے درمیان اختلاف کا اندیشہ ہو...۔“ (النساء 4:35)

یہاں ’خِفْتُمْ‘ میں جمع کی ضمیر سے مراد خاندان کے بڑے یا وہ اجتماعی ذمہ دار لوگ ہیں،

جنھیں اس بگاڑ کے وسیع اثرات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، اور میاں بیوی کو 'بَیْنِھِمَا' کہہ کر دونوں کو الگ کر دیا ہے۔ چنانچہ شقاق وہ مرحلہ ہے، جہاں گھر کے اندر اصلاح کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں، معاملہ ٹوٹ پھوٹ یا ظلم کے خطرے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کے اثرات خاندان اور پھر پورے معاشرے تک پھیلنے لگتے ہیں۔ اس موقع پر قرآن نے حکمین مقرر کرنے کی ہدایت دے کر سوسائٹی کو شامل کیا ہے، کیونکہ یہاں مسئلہ داخلی نہیں رہتا، بلکہ باقاعدہ سماجی نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔

یوں قرآن نے نشوز اور شقاق کے دونوں مراحل کو پوری وضاحت کے ساتھ الگ رکھا ہے۔ نشوز صرف ازدواجی اور داخلی معاملہ ہے، اس لیے آیت 34 کا مخاطب صرف شوہر ہے۔ شقاق سماجی مسئلہ ہے، اس لیے آیت 35 میں سوسائٹی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

آیت 34 میں 'فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ' اور آیت 35 میں 'وَاِنْ خِفْتُمْ'، دونوں اپنے اپنے مرحلے کے دائرۂ اختیار اور اصل مخاطب کو فیصلہ کن طور پر متعین کر دیتے ہیں۔

اس پورے اسلوب کو ایک سادہ دنیوی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک حکمران اپنی قوم سے عمومی خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے تمھارے محکموں پر افسر مقرر کیے ہیں، اس بنا پر کہ ذمہ داریاں اور وسائل ان کے سپرد کیے گئے ہیں۔ پس جو ماتحت درست رویہ اختیار کریں، وہ ان کی ہدایات پر کاربند رہیں گے، اور جن کے بارے میں تمھیں اندیشہ ہو کہ وہ ہدایات سے ہٹ رہے ہیں تو پہلے انھیں سمجھاؤ، پھر ضرورت ہو تو ان کے اختیارات میں کمی کرو، اور اگر اس پر بھی درست نہ ہوں تو ان کے خلاف تادیبی اقدام کرو۔ پھر اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو ان پر کوئی زیادتی کا راستہ نہ ڈھونڈو۔ یہاں خطاب پوری قوم سے ہے، لیکن عملی ہدایات صرف افسر کے لیے ہیں، کیونکہ مذکورہ تمام اقدامات اسی کے دائرۂ اختیار میں آتے ہیں۔

لیکن اگر یہی حکمران آگے کہے کہ اگر تمھیں خوف ہو کہ افسر اور ماتحت کے درمیان اختلاف اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ داخلی اصلاح ممکن نہیں رہی اور اس کا اثر پورے محکمے تک پہنچنے لگا ہے تو تم لوگ اس نزاع کو دیکھنے کے لیے دونوں کی طرف سے غیر جانب دار حکم مقرر کرو۔ اگر وہ اصلاح چاہتے ہوں گے تو ہم ان کے درمیان موافقت پیدا کر دیں گے۔ اس مقام پر خطاب کا رخ بدل جاتا ہے اور مخاطب اب افسر نہیں، بلکہ وہ اجتماعی ذمہ دار ہیں، جن پر محکمے کے عمومی نظم کی

حفاظت کی ذمہ داری ہے، کیونکہ اس درجے پر جھگڑا ادارے کے لیے خطرہ بن جاتا ہے۔

اس مثال میں دو مرحلے بالکل نمایاں ہیں: پہلا مرحلہ خالص افسر اور ماتحت کے باہمی نظم سے متعلق ہے اور تمام اقدامات اسی کردار کے سپرد ہیں۔ دوسرا مرحلہ وہ ہے، جہاں اختلاف اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ محکمے کا نظم متاثر ہونے لگتا ہے اور یوں معاملہ اوپر کی اتھارٹی کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی ترتیب قرآن نے نشوز اور شقاق کے دونوں مراحل میں قائم کی ہے۔ نشوز داخلی مسئلہ ہے، جس کا مخاطب صرف شوہر ہے اور شقاق سماجی مسئلہ ہے، جس میں سوسائٹی کے ذمہ داروں کو مخاطب کیا گیا ہے۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آل عمران

(8)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَ سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ الَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَ مَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ وَ لَمْ یُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾

ایمان والو، (آگے بھی خدا کی مدد چاہتے ہو تو) یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور اُس آگ سے بچو جو منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور اللہ اور اُس کے رسول کے فرماں بردار رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف بڑھ جانے کے لیے دوڑو جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اُن پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو ہر حال میں خرچ کرتے ہیں، خواہ تنگی ہو یا کشادگی، اور (جن پر خرچ کرتے

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿١٣٧﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٤١﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ۖ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿١٤٣﴾

ہیں، اُن کی طرف سے زیادتی بھی ہو تو) غصے کو دبا لیتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں ــــ (یہی خوبی سے عمل کرنے والے ہیں) اور اللہ اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو خوبی سے عمل کرنے والے ہوں ــــ اور جن کا معاملہ یہ ہے کہ جب کوئی بدکاری اُن سے ہو جاتی ہے یا اپنے حق میں کوئی برا کر بیٹھتے ہیں تو اُنھیں اللہ یاد آجاتا ہے اور وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ــــ اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخش دے ــــ اور جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ یہی ہیں کہ جن کا صلہ اُن کے پروردگار کی مغفرت ہے اور وہ باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور کیا ہی اچھا صلہ ہے یہ نیک عمل کرنے والوں کے لیے۔ 130-136

(ایمان والو، آخری فتح تمھاری ہو گی)۔ اِس کی بہت سی مثالیں تم سے پہلے گزر چکی ہیں۔ سو اپنی اِس سرزمین ہی میں چل پھر کر دیکھ لو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ہے۔ یہ اُن لوگوں کے لیے نہایت واضح تنبیہ ہے (جو پیغمبر کو جھٹلا دینے پر مصر ہیں) اور اُن کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں۔ (اِس لیے مطمئن رہو) اور (جو نقصان تمھیں پہنچا ہے، اُس سے) بے حوصلہ نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو غلبہ بالآخر تمھیں ہی حاصل ہو گا۔ (اِس وقت) اگر تم کو چوٹ لگی ہے تو ایسی ہی چوٹ (اِس سے پہلے) دشمن کو بھی لگ چکی ہے۔ اور دنوں کا یہ الٹ پھیر تو ہم لوگوں کے اندر اِس لیے کرتے ہیں کہ اُن کا امتحان کریں اور اِس لیے کہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے اُن لوگوں کو چھانٹ لے جو (اپنی جان دے کر بھی) حق کی گواہی دینے والے ہوں ــــ (اِن مصالح کو سمجھنے کی کوشش کرو) اور (یاد رکھو کہ) اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا ــــ اور اِس لیے کرتے ہیں کہ ایمان والوں کو اللہ الگ کر لے اور اِن منکروں کو مٹا دے۔ ــــ کیا تم نے

وَ مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾
وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾
وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾

یہی سمجھا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، اور اللہ نے ابھی اُن لوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنھوں نے تمھارے اندر سے جہاد کیا (اور جنھوں نے نہیں کیا)—اور اِس لیے کرتے ہیں کہ اللہ اُن کو بھی جان لے جو ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ (اب حوصلہ چھوڑ رہے ہو) اور موت کے (اِس طرح) سامنے آجانے سے پہلے تم اُس کی تمنا کرتے رہے ہو۔ سو (تمھاری یہ تمنا پوری ہو گئی، اِس لیے کہ) اب تو موت کو تم نے آنکھیں چار کر کے دیکھ لیا ہے۔ 137-143

محمد ایک رسول ہی ہیں۔ (اُن کے قتل ہو جانے کی خبر نے تمھارے قدم ڈگمگا دیے)۔ اُن سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں، (اور موت وحیات کے یہ مراحل اُن پر بھی آئے)۔ پھر کیا وہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ (یاد رکھو)، جو الٹا پھرے گا، وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ عنقریب اُن کو صلہ دے گا جو ہر حال میں اُس کے شکر گزار رہے ہیں۔ 144

(تم نے حوصلہ چھوڑ دیا) اور (اِس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے کہ) ہر شخص اللہ کے اذن سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق ہی دنیا سے رخصت ہوتا ہے اور (اِس کو بھی فراموش کر بیٹھے کہ) جو دنیا کا صلہ چاہے گا، اُس کو ہم اُسی میں سے دیں گے اور جو آخرت کا صلہ چاہے گا، اُس کو وہاں سے دیں گے اور اپنے شکر گزاروں کو ہم اُن کی جزا لازماً عطا فرمائیں گے۔ 145

(اِن حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو) اور (یاد رکھو کہ) کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی ہے تو اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں اُنھیں پیش آئیں، اُن سے نہ تو وہ پست ہمت ہوئے، نہ اُنھوں نے کم زوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے سپر ڈالی، (بلکہ ہر حال

میں ثابت قدم رہے) اور اللہ ایسے ہی ثابت قدم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اُن کی دعا بس یہ رہی کہ پروردگار، ہمارے گناہوں سے درگذر فرما؛ اپنے معاملات میں جو کچھ زیادتی ہم سے ہوئی ہے، اُسے معاف کر دے؛ ہمارے قدم جما دے اور اِن منکر لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ پھر اللہ نے اُن کو دنیا کا صلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا اجر بھی عطا فرمایا۔ (یہی ہیں جو خوبی سے عمل کرنے والے ہیں) اور اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو خوبی سے عمل کرنے والے ہوں۔ 146-148

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: محمد حسن الیاس

— 1 —

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ پھر ہر اُس شخص کو بخش دیا جاتا ہے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراتا ہو، اُس شخص کے سوا جس کے اور اُس کے بھائی کے درمیان عداوت ہو۔ اُن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اِن دونوں کو اُس وقت تک مہلت دو، جب تک یہ آپس میں صلح کے لیے راضی نہ ہو جائیں۔ (مسلم، رقم 4658)

—2 —

ہشام بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے کسی مسلمان بھائی سے قطع تعلق کیے رہے۔ اِس لیے کہ اگر دونوں نے تین دن سے زیادہ قطع تعلق کیے رکھا تو جب تک وہ اِس حالت میں رہیں گے، حق سے دور رہیں گے۔ اور (یاد رکھو کہ) جو پہلے رجوع کرے گا، اُس کا یہ پہل کرنا اُس کے لیے کفارہ بن جائے گا۔ اور (مزید یہ کہ) اگر ایک نے دوسرے کو سلام کیا، لیکن دوسرے نے جواب نہ دیا تو سلام کرنے والے کو فرشتے جواب دیں گے اور رد کرنے والے کو شیطان۔ پھر اگر دونوں اِسی قطع تعلق کی حالت میں دنیا سے رخصت ہو گئے تو دونوں جنت میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ (مسند احمد، رقم 15917)

3

جس شخص نے اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ قطع تعلق کیے رکھا، وہ دوزخ میں جائے گا، الّا یہ کہ اللہ خاص اپنی طرف سے اُس پر عنایت کی نظر فرمائے۔

(مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 24786)

تفہیم الآثار

ڈاکٹر عمار خان ناصر

سردارانِ فارس اور صحابہ کے مابین مکالمے

(16)

(11)

عَنْ سَيْفٍ، عَنْ مُحَمَّدٍ وَطَلْحَةَ وَعَمْرٍو وَزِيَادٍ بِإِسْنَادِهِمْ . . . قَالُوا: وَأَرْسَلَ سَعْدٌ إِلَى الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ وَبُسْرِ بْنِ أَبِي رُهْمٍ وَعَرْفَجَةَ بْنِ هَرْثَمَةَ وَحُذَيْفَةَ بْنِ مِحْصَنٍ وَرِبْعِيِّ بْنِ عَامِرٍ وَقِرْفَةَ بْنِ زَاهِرٍ التَّيْمِيِّ ثُمَّ الْوَاثِلِيِّ وَمَذْعُورِ بْنِ عَدِيٍّ الْعِجْلِيِّ وَالْمُضَارِبِ بْنِ يَزِيدَ الْعِجْلِيِّ وَمَعْبَدِ بْنِ مُرَّةَ الْعِجْلِيِّ ـــ وَكَانَ مِنْ دُهَاةِ الْعَرَبِ ـــ فَقَالَ: إِنِّي مُرْسِلُكُمْ إِلَى هَؤُلَاءِ الْقَوْمِ فَمَا عِنْدَكُمْ؟ قَالُوا جَمِيعًا: نَتْبَعُ مَا تَأْمُرُنَا بِهِ وَنَنْتَهِي إِلَيْهِ، فَإِذَا جَاءَ أَمْرٌ لَمْ يَكُنْ مِنْكَ فِيهِ شَيْءٌ نَظَرْنَا أَمْثَلَ مَا يَنْبَغِي وَأَنْفَعَهُ لِلنَّاسِ فَكَلَّمْنَاهُمْ بِهِ، فَقَالَ سَعْدٌ: هَذَا فِعْلُ الْحَزَمَةِ، اذْهَبُوا فَتَهَيَّئُوا، فَقَالَ رِبْعِيُّ بْنُ عَامِرٍ: إِنَّ الْأَعَاجِمَ لَهُمْ آرَاءٌ وَآدَابٌ، وَمَتَى نَأْتِهِمْ جَمِيعًا يَرَوْا أَنَّا قَدِ احْتَفَلْنَا بِهِمْ! فَلَا تَزِدْهُمْ عَلَى رَجُلٍ، فَمَالَئُوهُ جَمِيعًا عَلَى ذَلِكَ، فَقَالَ: فَسَرِّحُونِي، فَسَرَّحَهُ.

فَخَرَجَ رِبْعِيٌّ لِيَدْخُلَ عَلَى رُسْتُمَ عَسْكَرَهُ، فَاحْتَبَسَهُ الَّذِينَ عَلَى الْقَنْطَرَةِ، وَأَرْسَلَ إِلَى رُسْتُمَ لِمَجِيئِهِ، فَاسْتَشَارَ عُظَمَاءَ أَهْلِ فَارِسَ، فَقَالَ: مَا تَرَوْنَ؟ أَنُبَاهِي أَمْ

نَتَهَاوَنُ! [فَاجْتَمَعَ مَلَؤُهُمْ عَلَى الْمُبَاهَاةِ]، فَأَظْهَرُوا الزِّبْرِجَ، وَبَسَطُوا الْبُسُطَ وَالنَّمَارِقَ، وَلَمْ يَتْرُكُوا شَيْئًا، وَوُضِعَ لِرُسْتُمَ سَرِيرُ الذَّهَبِ، وَأُلْبِسَ زِينَتَهُ مِنَ الْأَنْمَاطِ وَالْوَسَايِدِ الْمَنْسُوجَةِ بِالذَّهَبِ. وَأَقْبَلَ رِبْعِيٌّ يَسِيرُ عَلَى فَرَسٍ لَهُ زَبَّاءَ قَصِيرَةٌ، مَعَهُ سَيْفٌ لَهُ مَشُوفٌ، وَغَمْدُهُ لِفَافَةُ ثَوْبٍ خَلِقٍ، وَرُمْحُهُ مَعْلُوبٌ بِقَدٍّ، مَعَهُ حَجَفَةٌ مِنْ جُلُودِ الْبَقَرِ، عَلَى وَجْهِهَا أَدِيمٌ أَحْمَرُ مِثْلُ الرَّغِيفِ، وَمَعَهُ قَوْسُهُ وَنَبْلُهُ.

فَلَمَّا غَشِيَ الْمَلِكَ وَانْتَهَى إِلَيْهِ وَإِلَى أَدْنَى الْبُسُطِ قِيلَ لَهُ: انْزِلْ، فَحَمَلَهَا عَلَى الْبِسَاطِ، فَلَمَّا اسْتَوَتْ عَلَيْهِ نَزَلَ عَنْهَا وَرَبَطَهَا بِوِسَادَتَيْنِ، فَشَقَّهُمَا ثُمَّ أَدْخَلَ الْحَبْلَ فِيهِمَا، فَلَمْ يَسْتَطِيعُوا أَنْ يَنْهَوْهُ، وَإِنَّمَا أَرَوْهُ التَّهَاوُنَ وَعَرَفَ مَا أَرَادُوا، فَأَرَادَ اسْتِحْرَاجَهُمْ. وَعَلَيْهِ دِرْعٌ لَهُ كَأَنَّهَا أَضَاةٌ وَيَلْمَقُهُ عَبَاءَةٌ بَعِيرِهِ قَدْ جَابَهَا وَتَدَرَّعَهَا، وَشَدَّهَا عَلَى وَسَطِهِ بِسَلَبٍ، وَقَدْ شَدَّ رَأْسَهُ بِمِعْجَرَتِهِ، وَكَانَ أَكْثَرَ الْعَرَبِ شَعْرَةً، ومِعْجَرَتُهُ نِسْعَةُ بَعِيرِهِ، وَلِرَأْسِهِ أَرْبَعُ ضَفَايِرَ قَدْ قُنَّ قِيَامًا كَأَنَّهُنَّ قُرُونُ الْوَعْلَةِ، فَقَالُوا: ضَعْ سِلَاحَكَ، فَقَالَ: إِنِّي لَمْ آتِكُمْ فَأَضَعَ سِلَاحِي بِأَمْرِكُمْ، أَنْتُمْ دَعَوْتُمُونِي، فَإِنْ أَبَيْتُمْ أَنْ آتِيَكُمْ كما أُرِيدُ رَجَعْتُ. فَأَخْبَرُوا رُسْتُمَ فَقَالَ: ائْذَنُوا لَهُ، هَلْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ وَاحِدٌ!

فَأَقْبَلَ يَتَوَكَّأُ عَلَى رُمْحِهِ، وَزِجُّهُ نَصْلٌ، يُقَارِبُ الْخَطْوَ وَيَزُجُّ النَّمَارِقَ وَالْبُسُطَ، فَمَا تَرَكَ لَهُمْ نِمْرِقَةً وَلَا بِسَاطًا إِلَّا أَفْسَدَهُ وَتَرَكَهُ مُنْهَتِكًا مُخَرَّقًا، فَلَمَّا دَنَا مِنْ رُسْتُمَ تَعَلَّقَ بِهِ الْحَرَسُ، وَجَلَسَ عَلَى الْأَرْضِ، وَرَكَّزَ رُمْحَهُ بِالْبُسُطِ، فَقَالُوا: مَا حَمَلَكَ عَلَى هَذَا؟ قَالَ: إِنَّا لَا نَسْتَحِبُّ الْقُعُودَ عَلَى زِينَتِكُمْ هَذِهِ. فَكَلَّمَهُ فَقَالَ: مَا جَاءَ بِكُمْ؟ قَالَ: اللّٰهُ ابْتَعَثَنَا، وَاللّٰهُ جَاءَ بِنَا لِنُخْرِجَ مَنْ شَاءَ مِنْ عِبَادَةِ الْعِبَادِ إِلَى عِبَادَةِ اللّٰهِ، وَمِنْ ضِيقِ الدُّنْيَا إِلَى سِعَتِهَا، وَمِنْ جَوْرِ الْأَدْيَانِ إِلَى عَدْلِ الْإِسْلَامِ، فَأَرْسَلَنَا بِدِينِهِ إِلَى خَلْقِهِ لِنَدْعُوَهُمْ إِلَيْهِ، فَمَنْ قَبِلَ مِنَّا ذَلِكَ قَبِلْنَا ذَلِكَ مِنْهُ وَرَجَعْنَا عَنْهُ، وَتَرَكْنَاهُ وَأَرْضَهُ يَلِيهَا دُونَنَا، وَمَنْ أَبَى قَاتَلْنَاهُ أَبَدًا حَتَّى نُفْضِيَ إِلَى مَوْعُودِ اللّٰهِ. قَالَ: وَمَا مَوْعُودُ اللّٰهِ؟ قَالَ: الْجَنَّةُ لِمَنْ مَاتَ عَلَى قِتَالِ مَنْ أَبَى، وَالظَّفَرُ لِمَنْ بَقِيَ.

فَقَالَ رُسْتُمُ: قَدْ سَمِعْتُ مَقَالَتَكُمْ، فَهَلْ لَكُمْ أَنْ تُؤَخِّرُوا هَذَا الْأَمْرَ حَتَّى نَنْظُرَ فِيهِ

وَتَنْظُرُوا! قَالَ: نَعَمْ، كَمْ أَحَبُّ إِلَيْكُمْ؟ أَيَوْمًا أَوْ يَوْمَيْنِ؟ قَالَ: لا بَلْ حَتَّى نُكَاتِبَ أَهْلَ رَأْيِنَا وَرُؤَسَاءَ قَوْمِنَا، وَأَرَادَ مُقَارَبَتَهُ وَمُدَافَعَتَهُ، فَقَالَ: إِنَّ مِمَّا سَنَّ لَنَا رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم وَعَمِلَ بِهِ أَبِيَّتُنَا أَلاَّ نُمَكِّنَ الأَعْدَاءَ مِنْ آذَانِنَا، وَلا نُؤَجِّلَهُمْ عِنْدَ اللِّقَاءِ أَكْثَرَ مِنْ ثَلاثٍ، فَنَحْنُ مُتَرَدِّدُونَ عَنْكُمْ ثَلاثًا، فَانْظُرْ فِي أَمْرِكَ وَأَمْرِهِمْ، وَاخْتَرْ وَاحِدَةً مِنْ ثَلاثٍ بَعْدَ الأَجَلِ: اخْتَرِ الإِسْلامَ وَنَدَعُكَ وَأَرْضَكَ، أَوِ الْجِزَاءَ فَنَقْبَلَ وَنَكُفَّ عَنْكَ، وَإِنْ كُنْتَ عَنْ نَصْرِنَا غَنِيًّا تَرَكْنَاكَ مِنْهُ، وَإِنْ كُنْتَ إِلَيْهِ مُحْتَاجًا مَنَعْنَاكَ، أَوِ الْمُنَابَذَةُ فِي الْيَوْمِ الرَّابِعِ، وَلَسْنَا نَبْدَؤُكَ فِيمَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْيَوْمِ الرَّابِعِ إِلا أَنْ تَبْدَأَنَا، أَنَا كَفِيلٌ لَكَ بِذَلِكَ عَلَى أَصْحَابِي وَعَلَى جَمِيعِ مَنْ تَرَى. قَالَ: أَسَيِّدُهُمْ أَنْتَ؟ قَالَ: لاَ، وَلَكِنَّ الْمُسْلِمِينَ كَالْجَسَدِ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ، يُجِيرُ أَدْنَاهُمْ عَلَى أَعْلاهُمْ.

فَخَلَصَ رُسْتُمُ بِرُؤَسَاءِ أَهْلِ فَارِسَ، فَقَالَ: مَا تَرَوْنَ؟ هَلْ رَأَيْتُمْ كَلامًا قَطُّ أَوْضَحَ وَلا أَعَزَّ مِنْ كَلامِ هَذَا الرَّجُلِ؟ قَالُوا: مَعَاذَ اللّٰهِ لَكَ أَنْ تَمِيلَ إِلَى شَيْءٍ مِنْ هَذَا وَتَدَعَ دِينَكَ لِهَذَا الْكَلْبِ! أَمَا تَرَى إِلَى ثِيَابِهِ! فَقَالَ: وَيْحَكُمْ لاَ تَنْظُرُوا إِلَى الثِّيَابِ، وَلَكِنِ انْظُرُوا إِلَى الرَّأْيِ وَالْكَلامِ وَالسِّيرَةِ، إِنَّ الْعَرَبَ تَسْتَخِفُّ بِاللِّبَاسِ وَالْمَأْكَلِ وَيَصُونُونَ الأَحْسَابَ، لَيْسُوا مِثْلَكُمْ فِي اللِّبَاسِ، وَلا يَرَوْنَ فِيهِ مَا تَرَوْنَ. وَأَقْبَلُوا إِلَيْهِ يَتَنَاوَلُونَ سِلاحَهُ، وَيُزَهِّدُونَهُ فِيهِ، فَقَالَ لَهُمْ: هَلْ لَكُمْ إِلَى أَنْ تَرَوْنِي فَأُرِيَكُمْ؟ فَأَخْرَجَ سَيْفَهُ مِنْ خِرْقِهِ كَأَنَّهُ شُعْلَةُ نَارٍ فَقَالَ الْقَوْمُ: اغْمِدْهُ، فَغَمَدَهُ، ثُمَّ رَمَى تُرْسًا وَرَمَوْا حَجْفَتَهُ، فَخَرَقَ تُرْسَهُمْ وَسَلِمَتْ حَجْفَتُهُ، فَقَالَ: يَا أَهْلَ فَارِسَ، إِنَّكُمْ عَظَّمْتُمُ الطَّعَامَ وَاللِّبَاسَ وَالشَّرَابَ وَإِنَّا صَغَّرْنَاهُنَّ، ثُمَّ رَجَعَ إِلَى أَنْ يَنْظُرُوا إِلَى الأَجَلِ.

فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْغَدِ بَعَثُوا أَنِ ابْعَثْ إِلَيْنَا ذَلِكَ الرَّجُلَ، فَبَعَثَ إِلَيْهِمْ سَعْدٌ حُذَيْفَةَ بْنَ مِحْصَنٍ، فَأَقْبَلَ فِي نَحْوٍ مِنْ ذَلِكَ الزِّيِّ، حَتَّى إِذَا كَانَ عَلَى أَدْنَى الْبِسَاطِ، قِيلَ لَهُ: انْزِلْ، قَالَ: ذَلِكَ لَوْ جِئْتُكُمْ فِي حَاجَتِي، فَقُولُوا لِمَلِكِكُمْ: أَلَهُ الْحَاجَةُ أَمْ لِي؟ فَإِنْ قَالَ: لِي فَقَدْ كَذَبَ، وَرَجَعْتُ وَتَرَكْتُكُمْ، فَإِنْ قَالَ: لَهُ لَمْ آتِكُمْ إِلا عَلَى مَا أُحِبُّ فَقَالَ: دَعُوهُ، فَجَاءَ حَتَّى وَقَفَ عَلَيْهِ وَرُسْتُمُ عَلَى سَرِيرِهِ، فَقَالَ: انْزِلْ، قَالَ: لا أَفْعَلُ، فَلَمَّا أَبَى

سَأَلَهُ: مَا بَالُكَ جِئْتَ وَلَمْ يَجِئْ صَاحِبُنَا بِالأَمْسِ؟ قَالَ: إِنَّ أَمِيرَنَا يُحِبُّ أَنْ يَعْدِلَ بَيْنَنَا فِي الشِّدَّةِ وَالرَّخَاءِ، فَهَذِهِ نَوْبَتِي.

قَالَ: مَا جَاءَ بِكُمْ؟ قَالَ: إِنَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ مَنَّ عَلَيْنَا بِدِينِهِ وَأَرَانَا آيَاتِهِ، حَتَّى عَرَفْنَاهُ وَكُنَّا لَهُ مُنْكِرِينَ، ثُمَّ أَمَرَنَا بِدُعَاءِ النَّاسِ إِلَى وَاحِدَةٍ مِنْ ثَلاثٍ، فَأَيُّهَا أَجَابُوا إِلَيْهَا قَبِلْنَاهَا: الإِسْلامُ وَنَنْصَرِفُ عَنْكُمْ، أَوِ الجَزَاءُ وَنَمْنَعُكُمْ إِنِ احْتَجْتُمْ إِلَى ذَلِكَ، أَوِ الْمُنَابَذَةُ، فَقَالَ: أَوِ الْمُوَادَعَةُ إِلَى يَوْمِ مَا؟ فَقَالَ: نَعَمْ، ثَلاثًا مِنْ أَمْسِ، فَلَمَّا لَمْ يَجِدْ عِنْدَهُ إِلا ذَلِكَ رَدَّهُ وَأَقْبَلَ عَلَى أَصْحَابِهِ، فَقَالَ: وَيْحَكُمْ! أَلا تَرَوْنَ إِلَى مَا أَرَى! جَاءَنَا الأَوَّلُ بِالأَمْسِ فَغَلَبَنَا عَلَى أَرْضِنَا، وَحَقَّرَ مَا نُعَظِّمُ، وَأَقَامَ فَرَسَهُ عَلَى زِبْرِجِنَا وَرَبَطَهُ بِهِ، فَهُوَ فِي يُمْنِ الطَّائِرِ، ذَهَبَ بِأَرْضِنَا وَمَا فِيهَا إِلَيْهِمْ مَعَ فَضْلِ عَقْلِهِ، وَجَاءَنَا هَذَا الْيَوْمَ فَوَقَفَ عَلَيْنَا، فَهُوَ فِي يُمْنِ الطَّائِرِ، يَقُومُ عَلَى أَرْضِنَا دُونَنَا، حَتَّى أَغْضَبَهُمْ وَأَغْضَبُوهُ.

فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْغَدِ أَرْسَلَ: ابْعَثُوا إِلَيْنَا رَجُلًا، فَبَعَثُوا إِلَيْهِمُ الْمُغِيرَةَ بْنَ شُعْبَةَ.

(تاریخ الطبری 3/521)

”سیف بن عمر نے محمد، طلحہ، عمرو اور زیاد سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن شعبہ، بُسر بن ابی رہم، عرفجہ بن ہرثمہ، حذیفہ بن محصن، رِبعی بن عامر، قرفہ بن زاہر تیمی (پھر واثلی)، مذعور بن عدی عجلی، مضارب بن یزید عجلی اور معبد بن مرہ عجلی کو—جو عرب کے بڑے مدبر اور زیرک لوگوں میں شمار ہوتا تھا—بلایا۔ سعد رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: میں تمھیں ان لوگوں، (یعنی اہل فارس) کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں، تو تم ان سے کیا کہو گے؟ سب نے جواب دیا: ہم وہی کہیں گے جس کا آپ ہمیں حکم دیں گے اور اسی کے پابند رہیں گے۔ البتہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آیا جس میں آپ کی طرف سے کوئی خاص ہدایت نہ ہو تو ہم غور کریں گے کہ کون سی بات زیادہ مناسب اور لوگوں کے لیے زیادہ فائدہ مند ہے، اور اہل فارس کو وہی بات کہہ دیں گے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا: ”یہی سمجھ داری کا طریقہ ہے، جاؤ اور تیاری کرو۔“ اس پر رِبعی بن عامر نے کہا: عجم کے لوگوں کے اپنے آداب اور طور طریقے ہیں۔ اگر ہم سب اکٹھے ان کے پاس جائیں گے تو وہ سمجھیں گے کہ ہم ان کو بڑی وقعت

دے رہے ہیں، لہٰذا آپ ان کے پاس صرف ایک آدمی کو بھیجیں۔ سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ رِبعی بن عامر نے کہا: ”مجھے ہی روانہ کر دیجیے۔“ چنانچہ سعد رضی اللہ عنہ نے انھیں بھیج دیا۔

رِبعی بن عامر روانہ ہوئے تاکہ رستم کے لشکر میں جا کر اس سے ملیں۔ جب وہ پل پر پہنچے تو محافظوں نے انھیں روک لیا، اور ان کے آنے کی اطلاع رستم کو بھیجی۔ رستم نے ایران کے بڑے سرداروں سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ کیا ہم اس (عرب نمایندے) کے سامنے اپنی شان و شوکت کا اظہار کریں یا بے پروائی کے ساتھ پیش آئیں؟ سب نے اتفاق کیا کہ اسے شان و شوکت سے مرعوب کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے سونے کی خوب نمایش کی، اور قیمتی قالین اور ریشمی گدے بچھائے اور (شان و شوکت کے اظہار میں) کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ رستم کے لیے سونے کا تخت رکھا گیا اور تخت کو قیمتی بچھونوں اور زری دار تکیوں سے آراستہ کیا گیا۔ رِبعی بن عامر اپنی ایک چھوٹی سی اور گھنے بالوں والی گھوڑی پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ ان کے پاس ایک چمک دار تلوار تھی جس پر انھوں نے ایک پرانا اور بوسیدہ کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ ان کا نیزہ ایک تسمے کے ساتھ لٹکا ہوا تھا، اور ایک ڈھال تھی جو گائے کی کھال کی بنی ہوئی تھی۔ ڈھال کے اوپر سرخ چمڑے کا ایک ٹکڑا تھا جو روٹی کی طرح گول تھا۔ ان کے پاس کمان اور تیروں کا ترکش بھی تھا۔

جب وہ بادشاہ (کے دربار) تک پہنچے اور سب سے پہلے بچھے ہوئے قالین کے قریب آئے تو ان سے کہا گیا کہ گھوڑی سے اتر جاؤ! مگر رِبعی نے اپنی گھوڑی کو قالین پر چڑھا دیا اور جب گھوڑی قالین پر چڑھ گئی تو وہ اس سے اتر آئے اور دو تکیوں کو پھاڑ کر ان کے بیچ سے رسی گزار کر گھوڑی کو ان کے ساتھ باندھ دیا۔ ایرانی انھیں روک نہ سکے، کیونکہ وہ ان سے بے اعتنائی ظاہر کرنا چاہتے تھے اور رِبعی بھی سمجھ گئے تھے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، اس لیے انھوں نے بھی ایرانیوں کو تنگ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ رِبعی کے بدن پر ایک زرہ تھی جو تالاب کے پانی کی طرح چمک رہی تھی۔ ان کے جسم پر اونٹ کے چمڑے کی بنی ہوئی عبا تھی، جسے انھوں نے (اپنے جسم کے مطابق) کاٹ کر زرہ کے طور پر پہنا ہوا تھا اور اپنی کمر پر اسے ایک تسمے سے باندھ رکھا تھا۔ انھوں نے اپنے سر کو عقال سے باندھ رکھا تھا۔ رِبعی کے سر پر پورے عرب میں سب سے زیادہ

بال تھے۔ ان کے سر پر بندھا ہوا عقال دراصل ان کے اونٹ (کے پالان کو باندھنے) کی رسی تھی۔ ان کے بالوں کی چار موٹی چوٹیاں بنی ہوئی تھیں جو اس طرح تنی ہوئی تھیں، جس طرح کسی پہاڑی بکرے کے سینگ ہوں۔ محافظوں نے ان سے کہا کہ اپنے ہتھیار اتار دو تو رِبعی نے کہا کہ میں خود تمھارے پاس نہیں آیا کہ تمھارے کہنے پر اپنے ہتھیار اتار دوں۔ تم نے مجھے بلایا ہے، اگر تم یہ نہیں چاہتے کہ میں اس حالت میں آؤں، جیسے میں چاہتا ہوں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ محافظوں نے رستم کو اطلاع دی تو اس نے کہا کہ اسے آنے دو، وہ ایک ہی تو آدمی ہے۔

رِبعی اپنے نیزے پر ٹیک لگاتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے نیزے کا پھل ننگا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہے تھے اور (اپنے نیزے سے) قالینوں اور بچھونوں کو پھاڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے وہاں پڑا ہوا کوئی قالین اور بچھونا ایسا نہیں چھوڑا جسے کاٹ پھاڑ کر برباد نہ کر دیا ہو۔ جب وہ رستم کے قریب پہنچے تو محافظوں نے انھیں پکڑ کر روک لیا۔ وہ زمین پر بیٹھ گئے اور اپنا نیزہ بچھونوں کے اندر گاڑ دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو رِبعی نے کہا کہ ہم تمھاری ان زینتوں پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔ رستم ان سے مخاطب ہوا اور پوچھا کہ تم لوگ کس لیے یہاں آئے ہو؟ رِبعی نے جواب دیا کہ ہمیں اللہ نے (اس دین کے ساتھ) کھڑا کیا ہے اور وہی ہمیں یہاں لایا ہے تاکہ وہ جن کو چاہے، انھیں ہم انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی کی طرف، اور دنیا کی تنگی سے اللہ کی بندگی کی وسعت کی طرف اور مذاہب کے جور و ستم سے اسلام کے انصاف کی طرف لے کر آئیں؛ اس نے ہمیں اپنا دین دے کر اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم اسے اس دین کی طرف بلائیں۔ تو جو ہماری دعوت قبول کرے گا، ہم بھی اس کا ایمان قبول کر لیں گے اور اسے چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے، اور ان کو اور ان کے علاقے کو انھی کے حوالے کریں گے، لیکن جو انکار کرے گا، ہم اس سے جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ ہم اللہ کے وعدے کو حاصل کر لیں۔ رستم نے پوچھا کہ اللہ کا وعدہ کیا ہے؟ رِبعی نے کہا کہ جو انکار کرنے والوں کے خلاف جنگ میں شہید ہوں گے، ان کو جنت ملے گی اور جو زندہ رہیں گے، وہ (دشمن پر) فتح پائیں گے۔

رستم نے کہا: میں نے تمھاری بات سنی ہے، تو کیا تم لوگ اس معاملے کو کچھ موخر کرنا چاہو گے تاکہ ہم بھی غور کر لیں اور تم بھی سوچ لو؟ رِبعی نے کہا: ہاں، تم کتنا وقت چاہتے ہو، ایک دن یا دو

دن؟ رستم نے کہا: نہیں، ہمیں اتنا وقت چاہیے کہ ہم اپنے اہل الرائے اور اپنی قوم کے سرداروں سے مشورہ کر لیں۔ وہ دراصل رِبعی کو مفاہمت پر اور جنگ سے دور رہنے پر آمادہ کرنا چاہتا تھا۔ رِبعی نے کہا: ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت قائم کی ہے اور ہمارے ائمہ بھی اس پر عمل کرتے آ رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ ہم دشمن کو اپنے کانوں پر قدرت نہ دیں، (یعنی ان کی بہت زیادہ باتیں نہ سنتے رہیں) اور میدان میں آ جانے کے بعد انھیں تین دن سے زیادہ مہلت نہ دیں۔ پس ہم تین دن تک تم سے رکے رہیں گے، تم اپنے اور اپنے لوگوں کے معاملے پر غور کر لو اور تین راستوں میں سے ایک کا انتخاب کر لو: یا تو اسلام قبول کرو، اس صورت میں ہم تمھیں اور تمھارے علاقے کو چھوڑ کر چلے جائیں گے یا جزیہ دینا منظور کر لو، ہم جزیہ قبول کر کے تم پر حملہ نہیں کریں گے۔ اگر تمھیں ہماری مدد کی ضرورت نہ ہو تو ہم نہیں کریں گے، لیکن اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو (جزیے کے بدلے میں) ہم تمھاری حفاظت کریں گے۔ اور (تیسرا راستہ یہ ہے کہ) چوتھے دن ہم تم سے جنگ کریں گے، البتہ ہم اس مدت کے دوران میں جنگ کی ابتدا نہیں کریں گے، جب تک تم خود آغاز نہ کرو۔ میں اپنے ساتھیوں کی طرف سے اور اس سارے لشکر کی طرف سے جسے تم دیکھ رہے ہو، اس کی پابندی کا ذمہ دار ہوں۔ رستم نے پوچھا: کیا تم ان کے سردار ہو؟ رِبعی نے کہا: نہیں، لیکن مسلمان ایک جسم کے مانند ہیں، ان کا ایک ادنیٰ فرد بھی سب سے بلند مرتبہ رکھنے والے کی طرف سے پناہ دے سکتا ہے۔

اس پر رستم نے اہل فارس کے سرداروں کے ساتھ علیحدگی میں گفتگو کی اور کہا: تمھارا کیا خیال ہے؟ کیا تم نے کبھی اس شخص کی گفتگو سے زیادہ واضح اور پر اعتماد بات سنی ہے؟ انھوں نے کہا: خدا کی اس سے پناہ کہ تم اس شخص کی باتوں سے متاثر ہو جاؤ اور اس سگ کے لیے اپنا دین چھوڑ دو! تم اس کے لباس کو نہیں دیکھتے؟ رستم نے کہا: تم پر افسوس ہے، لباس کو مت دیکھو بلکہ اس کی رائے، گفتار اور کردار کو دیکھو۔ عرب کے لوگ لباس اور کھانے پینے کو حقیر سمجھتے ہیں، مگر نسب اور عزت کو عزیز رکھتے ہیں۔ وہ پوشاک میں تمھارے جیسے نہیں ہیں اور نہ اس کو اتنی وقعت دیتے ہیں، جتنی تم دیتے ہو۔ پھر وہ لوگ رِبعی کے پاس آئے اور ان کے ہتھیاروں کو ہاتھ لگا لگا کر ان کا معمولی پن رِبعی کو جتانے لگے۔ رِبعی نے کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں دکھاؤں؟ پھر انھوں نے اپنی تلوار کو نیام سے نکالا تو وہ آگ کے شعلے کی طرح چمک رہی تھی۔

لوگوں نے کہا: اسے نیام میں ڈال دو تو انھوں نے ڈال دی۔ پھر رِبعی نے اپنی ڈھال پھینکی اور انھوں نے بھی اپنی ڈھال پھینکی۔ ان کی ڈھال (گر کر) پھٹ گئی، جب کہ رِبعی کی سالم رہی۔ رِبعی نے کہا: اے اہلِ فارس، تم نے کھانے پینے کی چیزوں اور لباس کو بہت اہم سمجھ لیا ہے، مگر ہم ان سب کو معمولی سمجھتے ہیں۔ پھر رِبعی وہاں سے واپس چلے آئے تاکہ وہ لوگ مہلت مکمل ہونے تک غور و فکر کر لیں۔

جب اگلا دن ہوا تو اہل فارس نے پیغام بھیجا کہ اس آدمی کو دوبارہ ہمارے پاس بھیجو۔ اس پر سعد رضی اللہ عنہ نے حذیفہ بن محصن کو بھیجا۔ وہ بھی اسی طرح کی وضع قطع میں گئے اور جب سب سے پہلے قالین تک پہنچے تو ان سے کہا گیا کہ (سواری سے) اتر جاؤ۔ حذیفہ نے کہا: اگر میں اپنی ضرورت کے تحت آیا ہوتا تو اتر جاتا۔ تم اپنے بادشاہ سے پوچھو کہ آیا اس کو ضرورت ہے یا مجھے؟ اگر وہ کہے کہ مجھے ضرورت ہے تو وہ غلط کہہ رہا ہے، میں تمھیں چھوڑ کر واپس چلا جاؤں گا؛ اور اگر وہ کہے کہ اسے (مجھ سے ملنے کی) ضرورت ہے تو پھر میں اسی حالت میں آؤں گا جو مجھے پسند ہے۔ رستم نے کہا کہ اسے آنے دو۔ چنانچہ حذیفہ آئے اور رستم کے پاس پہنچ کر، جو اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا، رک گئے۔ رستم نے کہا کہ نیچے اترو تو حذیفہ نے کہا کہ میں نہیں اتروں گا۔ جب وہ نہیں مانے تو رستم نے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ آج تم آئے ہو اور وہ کل والا آدمی نہیں آیا؟ حذیفہ نے کہا کہ ہمارا امیر چاہتا ہے کہ سختی اور آسانی میں ہمارے درمیان برابری رکھے تو آج میری باری ہے۔

رستم نے پوچھا: تم لوگ کیوں آئے ہو؟ حذیفہ نے کہا: اللہ نے ہمیں اپنے دین سے نوازا اور ہمیں اپنی نشانیاں دکھائیں، یہاں تک کہ ہم نے اس کو پہچان لیا، جب کہ اس سے پہلے ہم اس سے ناواقف تھے۔ پھر اس نے ہمیں حکم دیا کہ لوگوں کو تین چیزوں میں سے کسی ایک کو قبول کر لینے کی دعوت دیں اور ان میں سے جو بات بھی وہ اختیار کرنا چاہیں، ہم اس کو قبول کر لیں: یا تو تم اسلام قبول کر لو اور ہم تمھارے علاقے سے چلے جائیں گے یا جزیہ ادا کرو اور (بدلے میں) ہم تمھاری حفاظت کریں گے، اگر تمھیں اس کی ضرورت ہو اور یا پھر جنگ ہو گی۔ رستم نے کہا کہ کیا کسی خاص مدت کے لیے صلح کا معاہدہ بھی ہو سکتا ہے؟ حذیفہ نے کہا کہ ہاں، گذشتہ کل سے لے کر تین دن تک (ہمارا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے)۔ جب رستم کو ان سے اس کے علاوہ

کوئی جواب نہ ملا تو اس نے حذیفہ کو واپس بھیج دیا اور اپنے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا: تمھارا ناس ہو! کیا تم وہ نہیں دیکھ رہے، جو میں دیکھ رہا ہوں؟ کل جو شخص آیا تھا، اس نے ہماری زمین پر قبضہ جما لیا، اور جن چیزوں کو ہم بڑی وقعت دیتے ہیں، ان کو حقیر سمجھا، اور اپنی گھوڑی کو ہمارے سونے سے آراستہ بچھونوں پر چڑھا دیا اور ان کے ساتھ باندھ دیا۔ اس کے ستارے اچھے تھے۔ وہ عقل و فہم میں بھی برتر تھا اور ہماری زمین اور اس کی چیزیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اور آج یہ شخص آیا ہے اور ہمارے پاس کھڑا رہا ہے۔ اس کے ستارے بھی اچھے ہیں۔ وہ ہماری زمین پر کھڑا ہے، جب کہ ہم کھڑے نہیں ہیں۔ یہ باتیں کر کے رستم نے اہل فارس کو اور (جواب میں) اہل فارس نے رستم کو غضب ناک کر دیا۔

جب اگلا دن ہوا تو انھوں نے پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس کسی آدمی کو بھیجو۔ چنانچہ مسلمانوں نے مغیرہ بن شعبہ کو ان کی طرف بھیجا۔"

لغوی تشریح

'دُهَاة': 'داهية' کی جمع ہے۔ انتہائی عقل مند اور صاحب تدبیر کو کہا جاتا ہے۔ 'دُهَاة الْعَرَبِ'، یعنی عرب کے زیرک اور مدبر لوگ۔

'اِحْتَفَلْنَا بِهِمْ': 'احتفال' کا لفظی مطلب کسی کا پرجوش استقبال کرنا ہوتا ہے۔ یہاں مراد اہمیت دینا اور وقعت کی نظر سے دیکھنا ہے۔

'نُبَاهِي': 'بهاء' سے ہے، جس کا مطلب رونق اور شان و شوکت ہوتا ہے۔ 'نُبَاهِي'، یعنی اپنی شان و شوکت کا اظہار کریں۔

'نَتَهَاوَنُ': 'هون' سے مشتق ہے جس کا مطلب ذلت اور حقارت ہوتا ہے۔ 'نَتَهَاوَنُ'، یعنی ہم اس کو یہ احساس دلائیں کہ اسے اہمیت یا وقعت نہیں دی جا رہی۔

'زَبَّاءُ': 'أَزَبّ' کا مونث ہے، یعنی لمبے اور گھنے بالوں والی گھوڑی۔

'مَشُوفٌ': چمکتی ہوئی، آب دار۔

'مَعْلُوبٌ': لپٹا ہوا، ملفوف۔

'أَضَاةٌ': چھوٹے تالاب کو کہتے ہیں۔ تالاب کا پانی دھوپ میں چمکتا ہے۔ یہاں زرہ کو اسی پہلو

سے تالاب سے تشبیہ دی گئی ہے۔

'مُعْجَرَۃ': سر پر لپیٹا جانے والا رومال۔

'الیَلْمَق': قبا۔

'المُنَابَذَۃ': 'نبذ' کا لفظی مطلب کسی چیز کو پھینکنا ہوتا ہے۔ معاہدے اور امان کو ختم کرنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے 'مُنَابَذَۃ' جنگ کے اعلان اور دعوت پیکار کے مفہوم میں آتا ہے۔

شرح ووضاحت

1۔ جنگ قادسیہ سے پہلے ایرانی سپہ سالار رُستم کے ساتھ مسلمانوں کی گفتگو مختلف مراحل میں کئی دن تک جاری رہی تھی اور اس کے لیے باری باری مختلف حضرات کو بھیجا گیا تھا۔ زیر بحث روایت میں پہلے مرحلے کا ذکر ہے، جب رِبعی بن عامر، حذیفہ بن محصن اور مغیرہ بن شعبہ کو الگ الگ دنوں میں رستم کے ساتھ گفتگو کے لیے بھیجا گیا۔ اس سے اگلے مرحلے پر باقی اہل الرائے کا ایک وفد اجتماعی گفتگو کے لیے بھیجا گیا تھا، جس کی تفصیل آیندہ روایات میں بیان ہو گی۔

2۔ رِبعی بن عامر نے رستم کے ساتھ اپنی گفتگو میں مسلمانوں کے اقدام کا ایک نمایاں مقصد یہ بتایا ہے کہ لوگوں کو بندوں کی غلامی کی جگہ خدا کی بندگی کی طرف اور ادیان کے جور وستم کی جگہ اسلام کے عدل کی طرف بلایا جائے۔ اس حوالے سے رِبعی بن عامر اور حذیفہ بن محصن نے اس پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے کہ مسلمان، اشرافیہ اور عام طبقات کی تقسیم پر یقین نہیں رکھتے اور، مثال کے طور پر، مسلمانوں کی نمایندگی اور ترجمانی کی ذمہ داری ان میں سے کسی کے بھی سپرد کی جا سکتی ہے۔ رِبعی نے واضح کیا کہ مسلمانوں کے نمایندے کی حیثیت سے اگر وہ تین دن تک حملہ نہ کرنے کی ضمانت دے رہے ہیں تو اس کی پابندی پورا لشکر کرے گا، کیونکہ مسلمانوں کے قانون کے مطابق مسلمانوں کا سب سے کم رتبہ شخص بھی اگر دشمن کو امان دے دے تو اس کی پابندی سب مسلمانوں پر لازم ہوتی ہے۔ اسی طرح حذیفہ بن محصن نے دوسرے دن رِبعی کی جگہ اپنے بھیجے جانے کی وجہ رستم کو یہ بتائی کہ مسلمانوں کا امیر مشکل اور آسان، ہر طرح کے امور میں سب کو ذمہ داری میں برابر شریک کرتا ہے، یعنی کچھ خاص امور کے لیے کچھ

خاص افراد کو منتخب کرنے اور دوسروں کو موقع نہ دینے کا امتیاز نہیں برتا جاتا۔

تخریج اور اختلاف طرق

رستم کے ساتھ رِبعی بن عامر اور حذیفہ بن محصن کے مکالموں کا یہ واقعہ سیف بن عمر کے طریق سے الکلاعی نے بھی نقل کیا ہے (الاکتفاء 2/457-461)۔ متن میں بریکٹ میں درج بعض جملے معنوی طور پر زیادہ مناسب ہونے کے پہلو سے ''الاکتفاء'' سے نقل کیے گئے ہیں۔

[باقی]

سید منظور الحسن

اسرا و معراج

تفہیم و تبیین جاوید احمد غامدی

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(7)

4۔ واقعۂ شق صدر اور معراج

ـــــ سینہ کھولنے اور معراج پر لے جانے کا واقعہ ـــــ

عن شريك بن عبد الله أنه قال: سمعت أنس بن مالك يقول: ليلة اسرى برسول الله صلى الله عليه وسلم من مسجد الكعبة انه جاءه ثلاثة نفر قبل أن يوحى إليه وهو نائم فى المسجد الحرام، فقال أولهم: أيهم هو؟ فقال اوسطهم: هو خيرهم، فقال آخرهم: خذوا خيرهم، فكانت تلك الليلة.

فلم يرهم حتى أتوه ليلةً أخرى فيما يرى قلبه، وتنام عينه، ـــــ ولا ينام قلبه، وكذلك الانبياء تنام أعينهم ولا تنام قلوبهم، ـــــ فلم يكلموه حتى احتملوه فوضعوه عند بئر زمزم، فتولاه منهم جبريل، فشق جبريل ما بين نحره

إلى لبته حتى فرغ من صدره وجوفه، فغسله من ماء زمزم بيده حتى أنقى جوفه، ثم أتي بطست من ذهب فيه تور من ذهب محشوًا إيمانًا وحكمةً، فحشا به صدره ولغاديده يعني عروق حلقه ثم أطبقه.

ثم عرج به إلى السماء الدنيا، فضرب بابًا من أبوابها، فناداه أهل السماء: من هذا؟ فقال: جبريل، قالوا: ومن معك؟ قال: معي محمد، قال: وقد بعث؟ قال: نعم، قالوا: فمرحبًا به واهلًا، فيستبشر به اهل السماء لا يعلم اهل السماء بما يريد الله به في الارض حتى يعلمهم.

فوجد في السماء الدنيا آدم، فقال له جبريل: هذا أبوك آدم فسلم عليه، فسلم عليه ورد عليه آدم، وقال: مرحبًا وأهلًا بابني، نعم الابن أنت فإذا هو في السماء الدنيا بنهرين يطردان، فقال: ما هذان النهران يا جبريل؟ قال: هذا النيل والفرات عنصرهما، ثم مضى به في السماء، فإذا هو بنهر آخر عليه قصر من لؤلؤ وزبرجد، فضرب يده، فإذا هو مسك أذفر، قال: ما هذا يا جبريل؟ قال: هذا الكوثر الذي خبأ لك ربك.

ثم عرج به إلى السماء الثانية، فقالت الملائكة له مثل ما قالت له الاولى: من هذا؟ قال: جبريل، قالوا: ومن معك؟ قال: محمد صلى الله عليه وسلم، قالوا: وقد بعث إليه؟ قال: نعم، قالوا: مرحبًا به وأهلًا.

ثم عرج به إلى السماء الثالثة، وقالوا له مثل ما قالت الاولى والثانية، ثم عرج به إلى الرابعة، فقالوا له مثل ذلك، ثم عرج به إلى السماء الخامسة، فقالوا مثل ذلك، ثم عرج به إلى السماء السادسة، فقالوا له مثل ذلك، ثم عرج به إلى السماء السابعة، فقالوا له مثل ذلك.

كل سماء فيها أنبياء قد سماهم، فأوعيت منهم إدريس في الثانية، وهارون في الرابعة، وآخر في الخامسة، لم احفظ اسمه، وإبراهيم في السادسة، وموسى في السابعة ـــ بتفضيل كلام الله ـــ فقال موسى: رب لم أظن أن يرفع علي أحد!

ثم علا به فوق ذلك بما لا يعلمه إلا الله، حتى جاء سدرة المنتهى، ودنا للجبار

رب العزة، فتدلى، حتى كان منه قاب قوسين أو أدنى، فأوحى الله فيما أوحى إليه خمسين صلاةً على امتك كل يوم وليلة.

ثم هبط حتى بلغ موسى، فاحتبسه موسى، فقال: يا محمد، ماذا عهد إليك ربك؟ قال: عهد إلي خمسين صلاةً كل يوم وليلة، قال: إن أمتك لا تستطيع ذلك فارجع، فليخفف عنك ربك وعنهم، فالتفت النبي صلى الله عليه وسلم إلى جبريل كانه يستشيره في ذلك، فأشار إليه جبريل: أن نعم إن شئت فعلًا به إلى الجبار، فقال وهو مكانه: يا رب، خفف عنا فإن امتي لا تستطيع هذا، فوضع عنه عشر صلوات.

ثم رجع إلى موسى، فاحتبسه فلم يزل يرددہ موسى إلى ربه حتى صارت إلى خمس صلوات، ثم احتبسه موسى عند الخمس، فقال: يا محمد، والله لقد راودت بني إسرائيل قومي على أدنى من هذا، فضعفوا فتركوه، فامتك اضعف أجسادًا وقلوبًا وأبدانًا وأبصارًا وأسماعًا، فارجع، فليخفف عنك ربك، كل ذلك يلتفت النبي صلى الله عليه وسلم إلى جبريل ليشير عليه ولا يكره ذلك جبريل، فرفعه عند الخامسة.

فقال: يا رب، إن أمتي ضعفاء أجسادهم وقلوبهم وأسماعهم وأبصارهم وأبدانهم، فخفف عنا، فقال الجبار: يا محمد، قال: لبيك وسعديك، قال: إنه لا يبدل القول لدي كما فرضته عليك في أم الكتاب، قال: فكل حسنة بعشر أمثالها فهي خمسون في أم الكتاب وهي خمس عليك.

فرجع إلى موسى، فقال: كيف فعلت؟ فقال: خفف عنا أعطانا بكل حسنة عشر أمثالها، قال موسى: قد والله راودت بني إسرائيل على أدنى من ذلك فتركوه، ارجع إلى ربك فليخفف عنك أيضًا.

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يا موسى، قد والله استحييت من ربي مما اختلفت إليه، قال: فاهبط باسم الله.

قال: واستيقظ وهو في مسجد الحرام. (بخاری، رقم 7517)

”شریک بن عبداللہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو اُس رات کے بارے میں یہ بیان کرتے سنا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجدِ کعبہ سے لے جایا گیا۔ (وہ بیان کرتے ہیں): وحی (کا سلسلہ) شروع ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تین افراد (فرشتے) آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ حرام میں سوئے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک نے پوچھا: اِن (لوگوں) میں سے وہ کون ہیں؟ دوسرے نے جواب دیا: وہ جو اِن (لوگوں) میں سب سے بہتر ہیں۔ تیسرے نے کہا: جو سب سے بہتر ہیں بس اُنھیں لے جایئے۔ (پھر وہ تینوں واپس چلے گئے)۔ اِس رات میں بس اتنا ہی معاملہ ہوا۔

اُس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں نہیں دیکھا، یہاں تک کہ یہی (تینوں افراد) ایک دوسری رات میں (دوبارہ) آئے۔ اُس وقت آپ کی کیفیت ایسی تھی کہ آپ کا دل دیکھ رہا تھا، مگر آپ کی آنکھیں سو رہی تھیں۔ ـــــ اور آپ کا دل کبھی نہیں سوتا تھا۔ سب نبیوں کا یہی معاملہ ہے کہ (نیند کے عالم میں بھی) اُن کی آنکھیں تو سو جاتی ہیں، مگر اُن کے دل کبھی نہیں سوتے۔ ـــــ اُنھوں نے آپ سے کوئی بات نہیں کی، بلکہ آپ کو اٹھایا اور زم زم کے کنوئیں کے پاس لے جا کر لٹا دیا۔ پھر اُن میں سے جبریل علیہ السلام نے آپ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ جبریل علیہ السلام نے آپ کے حلق سے لے کر زیریں سینے تک کے حصے کو چیر ڈالا اور سینے اور پیٹ کے اندر جو کچھ تھا، اُسے نکال دیا۔ پھر اُنھوں نے زم زم کا پانی لے کر اپنے ہاتھوں سے اسے دھویا۔ یہاں تک کہ پیٹ کو بالکل صاف کر دیا۔ پھر اُس کے بعد سونے کا ایک طشت لایا گیا، جس میں سونے ہی کا ایک آفتابہ رکھا تھا، جو ایمان اور حکمت سے لبریز تھا۔ جبریل علیہ السلام نے اُس سے آپ کے سینے اور حلق کی رگوں کو بھر دیا اور پھر سینے کو سی کر برابر کر دیا۔

پھر جبریل علیہ السلام آپ کو لے کر آسمانِ زیریں کی طرف پرواز کر گئے۔ (وہاں پہنچ کر) اُنھوں نے اُس کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ آسمان والوں کی طرف سے آواز آئی: کون آیا ہے؟ اُنھوں نے کہا: جبریل۔ پوچھا: آپ کے ساتھ کون ہیں؟ جواب دیا: میرے ساتھ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ پوچھا: کیا اُنھیں بلایا گیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: جی ہاں۔ اُنھوں نے کہا: مرحبا، خوش آمدید۔ اہل آسمان اِن (کی آمد) سے بہت خوش ہیں۔ (تاہم) آسمان والے نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ اِن سے زمین میں کیا چاہتے ہیں، یہاں تک کہ اُنھیں اِس

سے آگاہ کر دیا جائے۔

پھر اِس آسمانِ زیریں پر آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھا۔ جبریل علیہ السلام نے آپ سے کہا کہ یہ آپ کے والد آدم علیہ السلام ہیں، اِنھیں سلام کیجیے۔ آپ نے حضرت آدم علیہ السلام کو سلام کیا اور اُنھوں نے اُس کا جواب دیا۔ پھر آدم علیہ السلام نے کہا: مرحبا، خیر مقدم میرے بیٹے، آپ کیا ہی اچھے فرزند ہیں۔ پھر اِسی اثنا میں آپ نے آسمانِ زیریں پر دو نہریں بہتی ہوئی دیکھیں۔ آپ نے پوچھا: جبریل، یہ نہریں کیا ہیں؟ جبریل علیہ السلام نے بتایا: یہ نیل و فرات کی حقیقی صورت ہے۔ پھر وہ آپ کو لے کر وہاں سے آگے بڑھے اور آپ نے ایک اور نہر دیکھی، جس کے کنارے موتیوں اور زمرد کا ایک محل تھا۔ آپ نے اُس (نہر) میں ہاتھ ڈالا تو اُس کی مٹی بالکل خوش بو دار مشک جیسی تھی۔ آپ نے پوچھا: جبریل یہ کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا: یہ کوثر ہے، جو آپ کے پروردگار نے آپ کے لیے خاص کر رکھا ہے۔

اِس کے بعد جبریل علیہ السلام آپ کو لے کر دوسرے آسمان پر پہنچے۔ یہاں بھی فرشتوں نے وہی کچھ کہا، جو پہلے آسمان کے فرشتوں نے کہا تھا کہ کون آیا ہے؟ انھوں نے کہا: جبریل۔ اُنھوں نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ جواب دیا: میرے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ پوچھا: کیا اُنھیں بلایا گیا ہے؟ جبریل علیہ السلام نے کہا: جی ہاں۔ اُنھوں نے کہا: مرحبا، خوش آمدید۔

پھر جبریل علیہ السلام آپ کو تیسرے آسمان پر لے گئے۔ یہاں بھی فرشتوں نے وہی کچھ کہا، جو پہلے اور دوسرے آسمان کے فرشتوں نے کہا تھا۔ پھر جبریل علیہ السلام چوتھے آسمان پر لے گئے۔ یہاں بھی فرشتوں نے وہی کچھ کہا، جو پہلے کہا تھا۔ پھر وہ پانچویں آسمان پر لے گئے۔ یہاں بھی فرشتوں نے وہی کچھ کہا، جو پہلے کہا تھا۔ پھر چھٹے آسمان پر لے گئے۔ یہاں بھی فرشتوں نے وہی کچھ کہا، جو پہلے کہا تھا۔ پھر ساتویں آسمان پر لے گئے۔ یہاں بھی فرشتوں نے وہی کچھ کہا، جو پہلے کہا تھا۔

اِن میں سے ہر آسمان پر انبیاے کرام موجود تھے (جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات ہوئی تھی)۔ اُن انبیا کے نام بھی بیان کیے گئے تھے۔ (راوی بیان کرتے ہیں کہ) اِن میں سے یہ نام مجھے یاد ہیں: ادریس علیہ السلام دوسرے آسمان پر، ہارون علیہ السلام چوتھے آسمان پر، ایک اور نبی پانچویں آسمان پر ـــــ جن کا نام مجھے یاد نہیں ہے ـــــ ابراہیم علیہ السلام چھٹے آسمان پر

اور موسیٰ علیہ السلام ساتویں آسمان پر ـــــ اِس لیے کہ اُنھیں (دنیا میں) اللہ کے ساتھ کلام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ ـــــ موسیٰ علیہ السلام نے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریل علیہ السلام کے ہم راہ دیکھ کر اور یہ جان کر کہ آپ کو ساتویں آسمان سے بھی اوپر لے جایا جارہا ہے، تعجب سے) کہا: پروردگار، میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی مجھ سے بھی اوپر جائے گا!

پھر جبریل علیہ السلام آپ کو اِس (ساتویں آسمان) سے بھی اوپر اُن بلندیوں کی طرف لے گئے، جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے۔ پھر اللہ رب العزت نے نزول فرمایا اور آپ کے قریب ہوئے۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اللہ نے آپ کو وحی کی اور اُس کے ذریعے سے ہر روز و شب میں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا، جو تمھاری امت پر فرض ہوئیں۔

اِس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے نیچے اُترے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ موسیٰ علیہ السلام نے آپ کو روک لیا۔ اُنھوں نے دریافت کیا کہ اے محمد، اللہ نے آپ پر کیا ذمہ داری ڈالی ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھ سے ہر دن رات میں پچاس نمازوں کا عہد لیا گیا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: آپ کی امت میں اِس کی ہمت نہیں ہے، (لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ) آپ واپس تشریف لے جائیے اور اپنی اور اپنی امت کی جانب سے اِن میں کمی کی درخواست کیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جبریل علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے، گویا اِس بارے میں اُن سے مشورہ چاہتے ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے اثبات کا اظہار کیا کہ آپ جانا چاہیں تو ٹھیک ہے۔ چنانچہ آپ پھر اُسی مقام پر بارگاہِ الٰہی میں واپس پہنچے (جہاں پہلے حاضری ہوئی تھی)۔ آپ نے درخواست کی کہ پروردگار، ہمارے لیے اِس میں رعایت عطا فرمائیے، کیونکہ میری امت اِس کی طاقت نہیں رکھتی۔ (درخواست کو قبول کرتے ہوئے) اللہ تعالیٰ نے دس نمازیں کم کر دیں۔ (اب چالیس نمازیں رہ گئیں)۔

واپسی پر جب آپ موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے تو اُنھوں نے آپ کو پھر روک لیا۔ (اور وہی مشورہ دیا، جو پہلے دیا تھا، آپ مشورہ قبول کر کے پھر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہوئے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے آپ کو (تخفیف کے مشورے کے ساتھ) واپس بھیجنے کا سلسلہ جاری رہا، (اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف ہوتی رہی) یہاں تک کہ فرض نمازوں کی تعداد

پانچ رہ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام نے اِس کے بعد پھر آپ کو روکا اور (اور حسبِ معمول) کہا: اے محمد، اللہ کی قسم، میں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو اِس سے بھی کم پر راضی کرنا چاہا تھا، مگر اُنھوں نے کم زوری دکھائی اور اِس (فریضے) کو چھوڑ دیا۔ آپ کی امت تو قلب و بدن اور سماعت و بصارت میں زیادہ کم زور ہے، لہٰذا آپ ایک بار پھر جایئے تاکہ اللہ اِس میں مزید کمی فرما دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر مرتبہ جبریل علیہ السلام کی طرف دیکھا تاکہ اُن کی راے معلوم ہو۔ جبریل علیہ السلام نے اِسے ناپسند نہیں کیا۔ چنانچہ وہ پانچویں مرتبہ آپ کو لے گئے۔

آپ نے درخواست کی کہ پروردگار، میری امت کے لوگ قلب وبدن اور سماعت وبصارت میں کم زور ہیں، اِس لیے آپ سے مزید کمی کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے محمد، رسول اللہ نے کہا: لبیک وسعدیک (میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں)۔ اللہ نے فرمایا: میرا کہا ہوا تبدیل نہیں ہوتا۔ (چنانچہ حکم تو وہی رہے گا) جیسا کہ میں نے ام الکتاب، (یعنی لوح محفوظ) میں تم پر فرض کیا ہے۔ (البتہ، آپ کی امت کے لیے تخفیف کی صورت یہ ہو گی کہ اُن کی) ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہو گی۔ چنانچہ ام الکتاب میں یہ نمازیں پچاس ہی رہیں گی، مگر آپ کے لیے اِن کی تعداد پانچ ہو گی۔ (گویا ایک نماز کا درجہ دس نمازوں کے برابر ہو گا)۔

(یہ حکم لے کر) آپ واپس موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچے۔ اُنھوں نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ نے نمازوں میں اِس طرح تخفیف کی ہے کہ ایک (نماز کی) نیکی کو دس (نمازوں کی) نیکیوں کے برابر کر دیا ہے۔ اِس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے (وہی بات دہرائی اور) کہا: بخدا میں نے اپنی قوم بنی اسرائیل سے اِس سے بھی کم کا تقاضا کیا تھا، مگر اُنھوں نے کم زوری دکھائی اور اِس (فریضے) کو چھوڑ دیا۔ آپ ایک بار پھر جایئے تاکہ اللہ اِس میں مزید کمی کر دے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موسیٰ، بخدا، مجھے اب اپنے رب سے شرم آتی ہے کہ میں (اِس کام کے لیے) پھر اُس کے پاس جاؤں۔ (اِس پر) موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ (اچھا، تو بس پھر) اب اللہ کا نام لے کر نیچے اتر جایئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اِس کے بعد جب آپ بیدار ہوئے تو مسجدِ حرام میں تھے۔‘‘

پس منظر

یہ اِس سلسلے کا چوتھا اور آخری واقعہ ہے۔ یہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اِسے امام بخاری نے اپنی صحیح میں نقل کیا ہے۔ یہ واقعہ دو اجزا پر مشتمل ہے: پہلے جز میں شق صدر کا ذکر ہے۔ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک کو کھولا اور اُسے آبِ زم زم سے دھو کر اور ایمان و حکمت سے لبریز کر کے بند کر دیا۔ دوسرے جز میں معراج کی تفصیل بیان ہوئی ہے، جس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل امین کے ہم راہ آسمانوں کی طرف روانہ ہوئے۔ پھر درجہ بہ درجہ سات آسمانوں اور سدرۃ المنتہیٰ سے گزر کر بارگاہِ خداوندی میں حاضر ہوئے اور وہاں سے نمازوں کا تحفہ لے کر واپس لوٹے۔

یہ عام انسانی واقعہ نہیں ہے۔ اِس کا تعلق منصبِ نبوت کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ جب اِس منصب کے لیے کسی انسان کا انتخاب کرتے ہیں تو اُسے اپنی ہم کلامی اور مخاطبت سے فیض یاب کرتے ہیں۔ اِس مخاطبت کی مختلف صورتیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے مطابق اختیار کی جاتی ہیں۔ اِس امر کی وضاحت میں ”میزان“ میں لکھا ہے:

> ”نبوت کیا ہے؟ یہ مخاطبۂ الٰہی کے لیے کسی شخص کا انتخاب ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اِس منصب کے لیے جب اپنے بندوں میں سے کسی کا انتخاب کر لیتا ہے تو اُس سے کلام فرماتا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ انسان کو اِس کا شرف ہمیشہ دو ہی طریقوں سے حاصل ہوا ہے:
>
> ایک عام مخاطبت کے ذریعے سے جو پردے کے پیچھے سے ہوتی ہے۔ اِس میں بندہ ایک آواز سنتا ہے، مگر بولنے والا اُسے نظر نہیں آتا۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی ہوا۔ طور کے دامن میں ایک درخت سے یکایک اُنھیں ایک آواز آنی شروع ہوئی، لیکن بولنے والا اُن کی نگاہوں کے سامنے نہیں تھا۔
>
> دوسرے وحی کے ذریعے سے۔ یہ لفظ کسی کے دل میں کوئی بات ڈالنے کے لیے آتا ہے۔ اِس کی پھر دو صورتیں ہوتی ہیں: اولاً، اللہ تعالیٰ براہِ راست نبی کے دل میں اپنی بات ڈال دے۔ ثانیاً، فرشتہ بھیجے اور وہ اُس کی طرف سے نبی کے دل میں بات ڈالے۔ یہ معاملہ خواب اور بیداری، دونوں میں ہو سکتا ہے۔ پھر جو بات اُس میں کہی جاتی ہے، وہ خواب میں بعض اوقات مثل بھی ہو جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اِس کے نزول کی کیفیات روایتوں میں

بیان ہوئی ہیں، اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی شدید ترین صورت میں اِس سے پہلے گھنٹی کی سی آواز پیدا ہوتی تھی، یہاں تک کہ سخت ترین سردی کے موسم میں بھی آپ پسینے سے تر ہو جاتے تھے۔ اِس سے آگے اِس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ اِس کو سمجھنا انسان کے حدودِ علمی سے باہر ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ. قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا. (بنی اسرائیل 85:17)

”وہ تم سے روح کے متعلق پوچھتے ہیں (جو تم پر وحی کی جاتی ہے)۔ اِن سے کہو، یہ روح میرے پروردگار کا ایک حکم ہے اور اِس طرح کے حقائق کا تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔“

(131-130)

اِس تفصیل سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیا کے ساتھ تکلیم و تخاطب کی جو مختلف صورتیں اختیار کی جاتی تھیں، اُن میں نمایاں یہ ہیں:

1۔ اللہ کا اوٹ میں رہتے ہوئے براہِ راست کلام فرمانا۔

2۔ اللہ کا نبی کے دل میں اپنی بات ڈال دینا۔

3۔ اللہ کا فرشتے کے ذریعے سے بیداری میں اپنا پیغام پہنچانا۔

4۔ اللہ کا بیداری میں حقائق کو ممثل کر کے دکھانا۔

5۔ اللہ کا فرشتے کے ذریعے سے خواب میں اپنا پیغام پہنچانا۔

6۔ اللہ کا خواب میں حقائق کو ممثل کر کے دکھانا۔

واقعۂ معراج کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں موخر الذکر دو صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔

[باقی]

ڈاکٹر عرفان شہزاد

رمضان کی راتوں میں حرمتِ اکل و مباشرت

سورۂ بقرہ کی آیت 187 کے تناظر میں

سورۂ بقرہ (2) کی آیت 187 کی رو سے یہ سمجھا گیا ہے کہ شریعت میں پہلے یہ حکم تھا کہ رمضان میں افطار کے بعد یا سونے یا عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد کھانا، پینا اور بیویوں سے مقاربت ممنوع ہے۔ جب کچھ صحابہ سے رات میں مقاربت کی پابندی نہ ہو سکی تو سورۂ بقرہ (2) کی آیت 187 سے اِس پابندی کو منسوخ کر دیا گیا۔

آیت یہ ہے:

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ.

”(تم پوچھنا چاہتے ہو تو لو ہم بتائے دیتے ہیں کہ) روزوں کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جانا تمھارے لیے جائز کیا گیا ہے۔ وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔ اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اُس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے درگذر کیا۔ چنانچہ اب (بغیر کسی تردد کے) اپنی بیویوں کے پاس جاؤ اور (اِس

کا) جو (نتیجہ) اللہ نے تمھارے لیے لکھ رکھا ہے، اُسے چاہو۔‘‘

آیت کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ رمضان کی راتوں میں مذکورہ مسئلہ اجتماعی سطح پر درپیش تھا۔ روایات سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

لَمَّا نزل صومُ رمضان كانوا لاَ يقرَبُون النِّسَاءَ، رَمَضَان كُلّه، وَكَانَ رجَال يَخُونُونَ أَنْفُسَهُمْ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ: ’’عَلِمَ اللّٰهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ‘‘. (بخاری، رقم 4508)

’’جب رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا تو مسلمان پورا رمضان اپنی بیویوں کے پاس نہ جاتے۔ مرد حضرات اپنے نفسوں کے ساتھ خیانت کے مرتکب ہونے لگے۔ اِس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی: ’’اللہ نے دیکھا کہ تم اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے تو اُس نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے درگذر کیا۔‘‘‘

ابن کثیر لکھتے ہیں:

هَذِهِ رُخْصة مِنَ اللّٰهِ تَعَالَى لِلْمُسْلِمِينَ، ورَفْع لِمَا كَانَ عَلَيْهِ الْأَمْرُ فِي ابْتِدَاءِ الْإِسْلَامِ، فَإِنَّهُ كَانَ إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُهُمْ إِنَّمَا يَحِلُّ لَهُ الْأَكْلُ وَالشُّرْبُ وَالْجِمَاعُ إِلَى صَلَاةِ الْعِشَاءِ أَوْ يَنَامُ قَبْلَ ذَلِكَ، فَمَتَى نَامَ أَوْ صَلَّى الْعِشَاءَ حَرُمَ عَلَيْهِ الطَّعَامُ وَالشَّرَابُ وَالْجِمَاعُ إِلَى اللَّيْلَةِ الْقَابِلَةِ. فَوَجَدُوا مِنْ ذَلِكَ مَشَقة كَبِيرَةً. (تفسیر ابن کثیر 1/510)

’’یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں کے لیے رخصت عنایت کی گئی۔ ابتداے اسلام میں اُن پر جو پابندی تھی، وہ اٹھا لی گئی۔ یہ یوں تھا کہ اُن میں جب کوئی افطار کرتا تو اُس کے لیے کھانا، پینا اور جماع کرنا عشا تک یا سونے سے پہلے تک کے لیے حلال ہو جاتا۔ پھر جب وہ سو جاتا یا نماز عشا ادا کر لیتا تو اُس پر کھانا، پینا اور جماع کرنا اگلی رات تک کے لیے حرام ہو جاتا۔ اِس میں اُنھیں بڑی مشقت پیش آ رہی تھی۔‘‘

اِس کے برعکس، امام رازی ابو مسلم اصفہانی کی رائے نقل کرتے ہیں کہ شریعتِ محمدی میں یہ حرمتیں ثابت نہیں۔ یہ نصاریٰ میں رائج تھیں اور مسلمانوں کو قرآن کے اِس بیان سے وہم ہوا تھا کہ روزے اُسی طرح فرض ہیں جس طرح گذشتہ اقوام پر فرض تھے تو وہ اپنے تمام لوازم اور پہلوؤں کے ساتھ فرض ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے بھی رات کے لیے وہ حرمتیں اختیار کر لیں جو نصاریٰ میں رائج تھیں۔

وہ لکھتے ہیں:

وَقَالَ أَبُو مُسْلِمٍ الْاَصْفَهَانِيُّ هَذِهِ الْحُرْمَةُ مَا كَانَتْ ثَابِتَةً فِي شَرْعِنَا الْبَتَّةَ، بَلْ كَانَتْ ثَابِتَةً فِي شَرْعِ النَّصَارَى، وَاللّٰهُ تَعَالَى نَسَخَ بِهَذِهِ الْآيَةِ مَا كَانَ ثَابِتًا فِي شَرْعِهِمْ. (التفسیر الکبیر 5/267)	”ابو مسلم اصفہانی کہتے ہیں کہ یہ حرمتیں ہماری شریعت میں ثابت نہیں تھیں، بلکہ نصاریٰ کی شریعت میں موجود تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی شریعت میں ثابت شدہ اُن احکام کو اِس آیت سے منسوخ کیا ہے۔“

علامہ رشید رضا اپنی ”تفسیر المنار“ میں مذکورہ بالا روایات پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فَأَنْتَ تَرَى فِي هَذِهِ الرِّوَايَاتِ اضْطِرَابًا، فَفِي بَعْضِهَا أَنَّهُمْ كَانُوا يَرَوْنَ مُقَارَبَةَ النِّسَاءِ مُحَرَّمَةً فِي لَيَالِي رَمَضَانَ كَأَنْهُرِهِ عَلَى الْإِطْلَاقِ، وَفِي الْأُخْرَى أَنَّهُمْ كَانُوا يَعُدُّونَهَا كَالْأَكْلِ وَالشُّرْبِ لَا تَحْرُمُ إِلَّا بَعْدَ النَّوْمِ فِي اللَّيْلِ، وَأَقْرَبُ مَا يُمْكِنُ أَنْ يَخْرُجَ عَلَيْهِ الْجَمْعُ بَيْنَ الرِّوَايَتَيْنِ اخْتِلَافُ اجْتِهَادِ الصَّحَابَةِ فِي ذَلِكَ بِحَمْلِ كُلِّ رِوَايَةٍ عَلَى طَائِفَةٍ، وَإِلَّا تَعَارَضَتَا وَسَقَطَ الِاحْتِجَاجُ بِهِمَا. وَهَذَا الْجَمْعُ يُوَافِقُ مَا قَالَهُ الْأُسْتَاذُ	”آپ کو اِن روایات میں اضطراب نظر آئے گا۔ کچھ میں تو یہ ہے کہ صحابہ رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے مقاربت کو مطلقاً اُسی طرح حرام سمجھتے تھے، جیسا کہ دن میں، جب کہ دوسری روایات میں ہے کہ رات سونے کے بعد وہ اُسے کھانے پینے کی طرح ہی حرام تصور کرتے تھے۔ اِن دونوں روایتوں کو جمع کرنا اِسی طرح ممکن ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ ہر روایت صحابہ کے مختلف گروہوں کے اختلافِ اجتہاد کا نتیجہ تھی۔ اگر ایسا نہیں تو یہ باہم متعارض ہو

الْإِمَامُ، فَتَعَيَّنَ أَنَّ اجْتِهَادَهُمْ لَمْ يَكُنْ حُكْمًا قُرْآنِيًّا فَيُقَالُ إِنَّهُ نُسِخَ بِالْآيَةِ، وَإِنَّمَا هُوَ اجْتِهَادٌ أَوْقَعَهُمْ فِيهِ الْإِجْمَالُ فَجَاءَتْ هَذِهِ الْآيَةُ بِالْبَيَانِ (قَالَ): وَقَوْلُهُ: (أُحِلَّ لَكُمْ) لَا يَقْتَضِي أَنَّهُ كَانَ مُحَرَّمًا، بَلْ يَكْفِي فِيهِ أَنْ يُتَوَهَّمَ أَنَّ مِنْ كَمَالِ الصِّيَامِ أَوْ مِنْ شُرُوطِهِ عَدَمُ الْأَكْلِ بَعْدَ النَّوْمِ وَعَدَمُ مُقَارَبَةِ النِّسَاءِ بَعْدَهُ أَوْ مُطْلَقًا. وَهُوَ كَقَوْلِهِ تَعَالَى: (أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ) (۵: ۹۶) وَلَمْ يَكُنْ قَدْ سَبَقَ نَصٌّ فِي تَحْرِيمِهِ. (141/2)

جاتی ہیں اور اِن سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ روایات کو اِس طرح جمع کرنا استاذ امام مفتی عبدہ کے قول کے مطابق ہے۔ اُنھوں نے یہ طے کیا کہ صحابہ کا اجتہاد قرآنی حکم نہیں تھا کہ یہ کہا جائے کہ یہ اِس آیت سے منسوخ ہو گیا۔ یہ صرف اُن کا اجتہاد تھا، جو آیت کے اجمال کی وجہ سے پیش آیا، جسے اِس آیت (البقرہ 187:2) سے واضح کر دیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ارشادِ باری: 'أُحِلَّ لَكُمْ'، یعنی تمھارے لیے حلال کر دیا گیا، سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ پہلے حرام تھا۔ بلکہ اتنی بات کافی ہے کہ صحابہ کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ رمضان کی راتوں میں سو جانے کے بعد یا مطلقاً، کھانا اور بیویوں سے مقاربت روزے کے کمال کے منافی یا اُس کے شرائط میں شامل ہے۔ اور حلال کرنے کا یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت ہے کہ ''تمھارے لیے سمندر کا شکار حلال کیا گیا''، حالاں کہ اُس کی حرمت کا حکم پیشتر موجود نہیں ہے۔''

مولانا مودودی اِس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس بارے میں بھی لوگ ابتداءً غلط فہمی میں تھے۔ کسی کا خیال تھا کہ عشا کی نماز پڑھنے کے بعد سے کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے اور کوئی سمجھتا تھا کہ رات جب تک آدمی جاگ رہا ہو، کھا پی سکتا ہے۔ جہاں سو گیا، پھر دوبارہ اٹھ کر وہ کچھ نہیں کھا سکتا۔ یہ احکام لوگوں نے خود اپنے ذہن

میں سمجھ رکھے تھے۔‘‘(تفہیم القرآن 1 / 145)

مولانا امین احسن اصلاحی بھی اِسی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

’’بہت سے مسلمانوں نے بہ نظر احتیاط و تقویٰ یہ سمجھا کہ جس طرح روزے کی حالت میں، دن میں زن و شو کے تعلقات کی اجازت نہیں ہے، اِسی طرح شب میں بھی اس کی اجازت نہیں ہو گی۔ اس خیال کو اس بات سے بھی تقویت پہنچی ہو گی کہ یہود کے ہاں روزہ افطار کے معًا بعد پھر شروع ہو جاتا ہے جس کے سبب سے انھیں شب میں بھی وہ پابندیاں نباہنی پڑتی ہیں جو دن میں تھیں۔ چونکہ مسلمانوں کے سامنے عملی مثال کی حیثیت سے اہل کتاب ہی کا روزہ تھا اور قرآن میں اس کا حوالہ بھی دیا گیا تھا، اس وجہ سے انھوں نے از خود اپنے اوپر یہ پابندی عائد کر لی کہ دن کی طرح شب میں بھی ازدواجی تعلقات سے احتراز کرتے تھے۔‘‘(تدبر قرآن 1 / 456)

اگر یہ صریح پابندی ہوتی تو صحابہ کے ہاں اجتماعی سطح پر اِس کی خلاف ورزی کے مسلسل واقعات پیش نہ آتے۔ یہ ایک غیر یقینی یا مشتبہ پابندی تھی اور اِسی وجہ سے صحابہ اِس کی پابندی اختیار کرنے میں زیادہ حساس واقع نہ ہو رہے تھے۔

تاہم، اِس رائے پر یہ اشکالات پیدا ہوتے ہیں کہ ’اُحِلَّ لَکُمْ‘ کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ کسی حرمت کو حلت میں تبدیل کیا گیا ہے۔ ’فَالْئٰنَ‘ سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے کہ پہلے جو حرام تھا، وہ اب حلال ہو گیا۔ ’تَخْتَانُوْنَ‘ سے مزید تائید ہوتی ہے کہ مسلمان جو کر رہے تھے، وہ غلط تھا۔

اِس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں ’اُحِلَّ‘ محض کسی حرمت کو حلت میں تبدیل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ کسی حلت کے بارے میں حرمت کی غلط فہمی دور کرنے کے سلسلے میں بھی آیا ہے۔ مثلاً:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ. (المائدہ 5:4)	’’وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ اُن کے لیے کیا چیز حلال ٹھیرائی گئی ہے؟ کہہ دو: تمام پاکیزہ چیزیں تمھارے لیے حلال ہیں۔‘‘

طیبات ہمیشہ سے حلال ہی تھیں، لیکن جب کھانے پینے کی چیزوں کی حرمت کے احکام کا نزول شروع ہوا تو بعض ایسی چیزیں بھی حرام ٹھہرائی گئیں، جن کے بارے میں حلال ہونے کا گمان ہو سکتا تھا۔ اِس پر لوگوں نے پوچھا کہ اُن کے لیے کیا حلال کیا ہے تو فرمایا گیا کہ طیبات اُن

کے لیے حلال ہیں۔

دوسری آیت یہ ہے:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ. (الاحزاب 50:33)	”اے نبی، ہم نے تمھاری اِن بیویوں کو تمھارے لیے جائز کیا جن کے مہر تم دے چکے ہو اور تمھاری اِن مملوکات کو بھی تمھارے لیے حلال کیا جو اللہ نے تم کو بہ طور غنیمت عطا فرمائیں۔“

ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی لونڈیاں اِس آیت سے قبل بھی آپ کے نکاح میں تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال تھیں۔ اِس حلت کے اعادہ کی ضرورت منافقین کے پراپیگنڈے کی وجہ سے پیش آئی تھی۔ وہ لوگ آپ کے عام شرعی قاعدہ سے زائد نکاحوں پر معترض ہو رہے تھے۔

سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت میں ’اُحِلَّ‘ کا مفہوم یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں بیویوں سے مقاربت کے حرام ہونے کی جو غلط فہمی مسلمانوں کو لاحق ہوئی ہے، اُس کی وضاحت کر دی گئی کہ یہ حرام نہیں ہے۔ ’فَالْئٰنَ‘ کا مطلب ہے کہ جب بات واضح ہو گئی ”تو اب“ تم لوگ اپنی بیویوں کے پاس بغیر کسی احساسِ جرم کے جا سکتے ہو۔

احساسِ جرم کا مسئلہ یہ تھا کہ صحابہ اپنے اس گمان کے باوجود کہ رمضان کی راتوں میں بھی مباشرت جائز نہیں، اِس کے مرتکب ہو رہے تھے، اِس لیے اپنے گمان کے مطابق خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک دیانت داری اہم ہے۔ فرد پر لازم ہے کہ اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کرے، خواہ اجتہاد خطا ہو۔ اِس پر اُنھیں ملامت کی گئی۔

مولانا اصلاحی لکھتے ہیں:

”اس معاملہ میں چونکہ اب تک کوئی واضح ہدایت نہیں تھی اس وجہ سے اس کی نوعیت ایک مشتبہ معاملہ کی تھی۔ اس اشتباہ کے سبب سے بعض لوگ نفس کی اکساہٹ کے باعث کبھی کبھی اس چیز کے مرتکب بھی ہو جاتے تھے جو خود ان کے ضمیر کے نزدیک مشتبہ ہوتی۔ مشتبہ معاملات میں شریعت کی ہدایت، جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، یہ ہے کہ ’دع ما یریبك الی مَا

لا یریبك‘ مشتبہ کو چھوڑ کر آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جو غیر مشتبہ ہو۔ اگر اس کے برعکس آدمی مشتبہ پہلو کو اختیار کرے تو یہ خود اپنے نفس کے ساتھ ایک قسم کی خیانت ہوتی ہے، اس وجہ سے قرآن نے اس کو اپنے نفس کے ساتھ خیانت سے تعبیر فرمایا ہے لیکن چونکہ یہ احتیاط شریعت کے منشا کے خلاف تھی۔ محتاط مسلمانوں نے از خود اپنے اوپر عائد کر لی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس خیانت سے درگذر فرمایا اور واضح الفاظ میں شب میں بیویوں سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے دی۔‘‘ (تدبر قرآن 1/ 456)

خلاصہ

عہدِ رسالت میں صحابہ کے ہاں رمضان کی راتوں میں بعد از افطار بھی روزے کی پابندیاں برقرار رکھنے کا عمل پایا جاتا تھا، لیکن اِس کی بنیاد کوئی منصوص حکم نہیں تھا، جیسا کہ تفسیری روایات سے متبادر ہوتا ہے، بلکہ یہ رواج غالباً نصاریٰ سے در آیا تھا کیونکہ روزے رکھنے کے حکم میں گذشتہ اقوام میں اُن کا حوالہ دیا گیا تھا۔ رات میں جب بیویوں سے مقاربت کی اِس مشتبہ خود ساختہ پابندی نہ ہو سکی تو مسلم کمیونٹی میں سوال پیدا ہونے شروع ہوئے، جس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ (2) کی آیت 187 میں وضاحت کر دی کہ اُن پر یہ پابندی عائد نہیں ہے۔

تحقیق و تالیف: ڈاکٹر محمد عامر گزدر

صلاۃ التسبیح: فقہ و حدیث کی روشنی میں

[ایک تحقیقی مطالعہ]

(5)

7۔ حدیثِ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

صلاۃ التسبیح کے باب میں ایک روایت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے جو حدیث و آثار کے مندرجہ ذیل صرف تین مصادر میں نقل ہوئی ہے:

1۔ پہلی مرتبہ پانچویں صدی ہجری میں ابو بکر خطیب البغدادی (المتوفی: 463ھ) نے اپنی کتاب "ذکر صلاۃ التسبیح"، رقم 1 اور 2 میں اِس حدیث کے دو مختلف طریق نقل کیے ہیں۔

2۔ خطیب بغدادی کے کم و بیش چار سو سال بعد نویں صدی ہجری میں ابن ناصر الدین (المتوفی: 842ھ) نے بھی اپنی کتاب "الترجیح لحدیث صلاۃ التسبیح" کے صفحہ 51 اور 52 پر حدیثِ علی کے دو مختلف طریق نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک طریق اُنھوں نے صلاۃ التسبیح پر امام دار قطنی کی کتاب کی نسبت سے نقل کیا ہے اور دوسرا واحدی کی کتاب "الدعوات" کے حوالے کے ساتھ۔

3۔ ابن ناصر الدین کے علاوہ نویں صدی ہجری ہی میں حافظ ابن حجر العسقلانی (المتوفی: 852ھ) نے بھی اپنی کتاب "امالی الاذکار فی فضل صلاۃ التسبیح" کے صفحہ 33 اور 34 پر حدیثِ علی کے پہلے وہی دونوں طریق نقل کیے ہیں جو ابن ناصر الدین نے بیان کیے ہیں اور پھر صفحہ 36 پر ایک تیسرا طریق بھی بیان کیا ہے۔

اِن تین مصادر کے سوا حدیث و آثار کے باقی تمام مصادرِ اصلیہ صلاۃ التسبیح کے باب میں حدیثِ علی بن ابی طالب کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔

روایت کے متون اور اِن کے اضطرابات

ذیل میں پہلے ہم حدیث علی کے متون کا جائزہ لیں گے، جس سے اِن کے مضامین، اِن میں پائے جانے والے اضطرابات اور باہمی تناقضات بھی واضح ہوتے ہیں:

1۔ خطیب بغدادی کی ''ذکر صلاۃ التسبیح''، رقم 1 میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی نسبت سے یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے جمعے کے دن چار رکعتیں نماز اِس طرح پڑھی کہ وہ ہر رکعت میں 10 مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھے...''۔ اتنی بات کے بعد خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ پھر علی رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صلاۃ التسبیح کی مکمل حدیث بیان کی۔ اِس کے بعد خطیب بغدادی نے یہ کہا ہے کہ بالخصوص جمعے کے دن صلاۃ التسبیح پڑھنے کا ذکر سیدنا علی کی اِس روایت کے سوا کسی دوسرے صحابی کی روایت میں موجود نہیں ہے۔ یعنی اِس متن میں یہ ایک تفرد اور نکارت ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہر رکعت میں 10 مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے الفاظ بھی صرف اور صرف اِسی طریق میں وارد ہوئے ہیں۔ اِس لحاظ سے بھی یہ متن بالکل متفرد اور منکَر ہے۔

2۔ خطیب بغدادی کی ''ذکر صلاۃ التسبیح''، رقم 2 میں علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِن سے ملاقات ہوئی تو آپ نے اِن کی دونوں آنکھوں کے مابین بوسہ لیا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور علی رضی اللہ عنہ بیٹھے تو آپ نے اُن سے کہا: (اے علی)، کیا میں تمھیں ایک عطیہ اور تحفہ نہ دوں؟ علی رضی اللہ عنہ نے کہا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول۔ اِس کے بعد اِس روایت میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ صلاۃ التسبیح کا اُسی طرح ذکر ہے، جس طرح ابو رافع رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق یہ نماز آپ نے سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کو بتائی تھی۔ پھر زیرِ بحث متن کے مطابق علی رضی اللہ عنہ کو بھی روزانہ یا ہفتہ وار یا مہینا وار یا سالانہ یا عمر بھر میں ایک مرتبہ یہ نماز پڑھنے کی تلقین اُسی طرح کی بیان ہوئی ہے جس طرح سیدہ ام سلمہ کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عباس کو اِس کی تلقین

فرمائی تھی۔ حدیثِ علی کے آخر میں اِس نماز کی فضیلت میں حدیثِ عباس کی طرح یہ الفاظ بھی نقل ہوئے ہیں کہ 'فإذا فعلت ذلك، غفر الله ذنبك: كبيره وصغيره، خطأه وعمده، قديمه وحديثه'، ''سو جب تم یہ نماز پڑھو گے تو اللہ تمھارے نئے، پرانے، قصداً اور سہواً سرزد ہونے والے صغیرہ و کبیرہ تمام گناہ بخش دے گا''۔

3۔ ابن ناصر الدین کی ''الترجیح لحدیث صلاۃ التسبیح'' کے صفحہ 52 کے ایک طریق اور ابن حجر کی ''امالی الاذکار فی فضل صلاۃ التسبیح'' کے صفحہ 33 کی روایت کے مطابق علی رضی اللہ عنہ کو اِس نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام میں 15 مرتبہ تسبیحات پڑھنے کا حکم قراءت سے پہلے کے لیے دیا تھا، نہ کہ قراءت کے بعد کے موقع کے لیے، جب کہ ابن ناصر الدین کی اِسی کتاب کے صفحہ 52 ہی کے ایک طریق کے مطابق مذکورہ بالا پورا واقعہ سیدنا علی نے خود اپنے حوالے سے نہیں، بلکہ اپنے بھائی جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ جعفر بن ابی طالب سے آپ کی ملاقات ہوئی تو آپ نے اِس طرح اُن کا بوسہ لیا اور اُنھیں اِس نماز کا تحفہ دیا اور اِس کی یہ غیر معمولی فضیلت اُن سے بیان فرمائی۔ چنانچہ اِس سے حدیثِ علی کے مختلف متون کا یہ صریح اضطراب بھی واضح ہوا کہ صلاۃ التسبیح کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بتائے جانے کا واقعہ، معلوم نہیں کہ خود سیدنا علی کے ساتھ پیش آیا تھا یا پھر جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ۔

4۔ حافظ ابن حجر نے ''امالی الاذکار فی فضل صلاۃ التسبیح' کے صفحہ 36 پر ابو نعیم کی کتاب ''قربان المتقین'' کی نسبت سے علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور طریق کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اُس کے متن میں صلاۃ التسبیح کے باب کی دوسری تمام روایتوں کی صریح مخالفت پائی جاتی ہے، اِس لیے کہ اُس میں اِس نماز کے جمعے کے دن چاشت کے وقت پڑھنے کی تلقین آئی ہے، خواہ عمر بھر میں ایک ہی مرتبہ پڑھی جائے۔ علاوہ ازیں، اُس میں ہر رکعت کے قیام میں سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ کافرون، سورۂ اخلاص، سورۂ فلق، سورۂ ناس اور آیۃ الکرسی کو دس دس مرتبہ پڑھنے کی تاکید بیان ہوئی ہے اور تشہد میں 'سُبْحَانَ اللّٰهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَاللّٰهُ أَكْبَرُ، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ' کا ورد 40 مرتبہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں زمین و آسمان کے شرور سے حفاظت کی ضمانت بیان ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ ابو نعیم نے اِس روایت کی تخریج کرنے کے بعد کہا ہے کہ اِس کے متن میں جھوٹے الفاظ پائے جاتے ہیں اور اِس کے من گھڑت

ہونے کے آثار بالکل واضح ہیں۔ غرض یہ کہ یہ متن صلاۃ التسبیح کے باب کی دوسری تمام روایتوں کے برعکس اِس نماز کا ایک بالکل مختلف طریقہ بتاتا ہے، چنانچہ یہ متن منکَر بھی ہے اور ابو نعیم نے اِس کی تخریج کر کے خود ہی بتا دیا ہے کہ اِس کے من گھڑت ہونے کے شواہد بالکل واضح ہیں۔

تحقیقِ اسانید

حدیثِ علی کے مذکورہ بالا تمام طرق کی اسانید کا تحقیقی مطالعہ حسب ذیل ہے:

الف۔ کتاب ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 1 کی سند میں مندرجہ ذیل 4 علل پائی جاتی ہیں:

1۔ اِس سند میں ابو حنیفہ، محمد بن حنیفہ الواسطی نامی ایک راوی ہے، جس کی توثیق نہ صرف یہ کہ ائمۂ رجال سے ثابت نہیں ہے، بلکہ امام دار قطنی نے اِس کے بارے میں صراحت کی ہے کہ 'لیس بالقوی'، ''یہ راوی قوی نہیں ہے۔''[1]

2۔ اِسی سند میں ایک راوی الحسن بن جبلہ الشیرازی ہے، جس کے بارے میں ائمۂ رجال و محققینِ حدیث بالکل واقف نہیں ہیں کہ یہ کون شخص تھا۔ علم رجال کے مراجع اِس راوی کے تعارف سے بالکل خاموش ہیں، لہٰذا یہ ایک بالکل مجہول راوی ہے۔ ہیثمی (المتوفی: 807ھ) نے بھی یہی کہا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ یہ راوی کون ہے۔[2]

3۔ اِس میں ایک راوی ایوب بن سلیمان الرقی بھی مجہول ہے۔ علمِ رجال کے مراجع اِس حوالے سے بھی ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک نامعلوم راوی ہے۔

4۔ اِس سند میں عبد الاعلی بن عامر الثعلبی الکوفی نامی ایک راوی ہے، جس کو امام احمد، ابو زرعہ، ابن سعد اور فسوی نے 'ضعیف' قرار دیا ہے، جب کہ امام قطان اور ابن مہدی کے نزدیک

---

[1]۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال، الذہبی 3/532، رقم 7463۔ لسان المیزان، ابن حجر العسقلانی 7/109، رقم 6736۔

[2]۔ مجمع الزوائد و منبع الفوائد، ابو الحسن نور الدین علی بن ابی بکر الہیثمی 9/570۔

یہ ایک 'متروک' راوی ہے۔[3]

ب۔ کتاب ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 2 اور ''الترجیح لحدیث صلاۃ التسبیح''، ابن ناصر الدین کے صفحہ 52 کا وہ طریق جو واحدی کی کتاب ''الدعوات'' کی نسبت سے بیان ہوا ہے؛ اِن دونوں طرق کی اسانید میں ایک یکساں علت یہ ہے کہ اِن میں محمد بن محمد بن الاشعث نامی ایک راوی موجود ہے، جو 'وضاع' تھا۔ یہ نہ صرف یہ کہ حدیثیں گھڑتا تھا، بلکہ امام ابن عدی نے اِس کے بارے میں بتایا ہے کہ تشیع کی طرف شدید میلان کی وجہ سے اِس نے تقریباً ایک ہزار روایتوں پر مشتمل حدیث کا ایک پورا مجموعہ گھڑ لیا تھا، جس کو یہ لوگوں کے سامنے بیان کیا کرتا تھا۔ اُس کتاب کی بے بنیاد اور منکر روایتوں کی اسانید علی رضی اللہ عنہ سے ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی تھیں۔ امام دارقطنی سے اِس شخص کے بارے میں پوچھا گیا تو اُنھوں نے کہا: 'آیۃ من آیات اللہ، وضع ذاك الكتاب - يعني العلويات'، ''یہ شخص اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھا۔ سیدنا علی کی روایتوں پر مشتمل یہ کتاب اِس نے خود گھڑی تھی''۔[4]

یہ 'موضوع' سند پر مشتمل طریق ہے جس کا ذکر حافظ ابن حجر نے بھی ''امالی الاذکار فی فضل صلاۃ التسبیح'' کے صفحہ 34 پر کیا ہے۔

ج۔ علی رضی اللہ عنہ سے مروی جو طریق ابن ناصر الدین نے ''الترجیح لحدیث صلاۃ التسبیح''، کے صفحہ 52 پر نقل کیا ہے، اُس کی سند میں درجِ ذیل علتیں پائی جاتی ہیں:

1۔ اِس میں اسحاق بن ابراہیم بن نسطاس نامی ایک راوی ہے، جس کے بارے میں امام بخاری نے کہا ہے کہ 'فیہ نظر'۔ اہل علم واقف ہیں کہ امام بخاری کی اصطلاح میں یہ الفاظ اُن کی طرف سے کسی بھی راوی پر شدید جرح تصور کیے جاتے ہیں۔ اِسی طرح امام بخاری کا اِس راوی پر 'منکر الحدیث' کا حکم لگانا بھی نقل ہوا ہے۔ امام عقیلی اور ابن الجارود نے بھی اِس راوی کو 'منکر الحدیث'

---

[3]۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر العسقلانی 6/94-95، رقم 198۔

[4]۔ الکامل فی ضعفاء الرجال، ابو احمد عبد اللہ بن عدی 9/446، 449، رقم 1797۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال، الذہبی 4/27-28، رقم 8131۔

کہا ہے۔ امام ابن عدی، امام نسائی اور امام دار قطنی نے اِس کو 'ضعیف' قرار دیا ہے۔[5]

2۔ اِس سند میں ایک راوی عمر بن عبد اللہ المدنی ہے، جس کو امام یحییٰ بن معین، امام نسائی اور حافظ ابن حجر نے 'ضعیف' قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے اِس کو کثیر الارسال بھی بتایا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ اِس طریق میں بھی علی رضی اللہ عنہ سے اِس کی روایت 'مرسل' اور 'منقطع' ہی ہے۔ امام ابن معین نے کہا ہے کہ اِس نے کسی صحابی سے کوئی روایت نہیں سنی۔ ابن حبان نے کہا ہے کہ یہ راوی قابلِ حجت نہیں ہے۔ امام مالک نے اِس کو متروک قرار دیا ہے۔[6]

د۔ اِسی ضعیف راوی کی علی رضی اللہ عنہ سے براہِ راست مروی یہی 'مرسل' روایت ہے، جس کا ذکر حافظ ابن حجر نے بھی "امالی الاذکار فی فضل صلاۃ التسبیح" کے صفحہ 33 پر کیا ہے اور ساتھ ہی ابن حجر نے خود یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ اِس کی سند میں 'ضعف' اور 'انقطاع' ہے۔ بالبداہت واضح ہے کہ سند کا یہ ضعف عمر بن عبد اللہ نامی اِسی راوی کے علماے حدیث کے نزدیک 'ضعیف' ہونے کی وجہ سے ہے اور انقطاع اِس کے براہ راست حضرت علی سے روایت بیان کرنے کی وجہ سے ہے، دراں حالیکہ اِس نے کسی صحابی سے بالمشافہ کوئی روایت نہیں سنی، جیسا کہ امام یحییٰ بن معین نے صراحت کی ہے۔

روایت کی حیثیت اور اِس کا حکم

مندرجہ بالا تحقیق و مطالعہ سے متحقق ہوا کہ صلاۃ التسبیح کے باب میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نسبت سے مروی قولی حدیث کا استناد بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔ اصولِ روایت کی رو سے اِس حدیث کے بعض طرق کی اسانید متعدد علل کی وجہ سے بالکل واہی اور انتہائی کم زور ہیں، جب کہ بعض من گھڑت ثابت ہوئی ہیں۔ سند کے علاوہ حدیثِ علی

---

[5]۔ دیکھیے: الضعفاء الکبیر، ابو جعفر العقیلی 1/295، رقم 116۔ الضعفاء والمتروکون، النسائی، ص 18، رقم 45۔ الضعفاء والمتروکون، الدار قطنی، 1/257، رقم 95۔ لسان المیزان، ابن حجر العسقلانی 2/32، رقم 985۔

[6]۔ تہذیب الکمال، المزی 21/420-423، رقم 4271۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر 7/471-472، رقم 784؛ جامع التحصیل فی احکام المراسیل، صلاح الدین ابو سعید الدمشقی، ص 242، رقم 558۔

اپنے متون کے بعض باہمی تناقضات واضطرابات کی وجہ سے بھی ناقابلِ اعتبار ہے۔ اِس کے بعض طرق متن کے اعتبار سے بھی 'منکر' ہیں، اِس لیے کہ اُن میں صلاۃ التسبیح کے باب کی دوسری روایتوں سے صریح اختلاف پایا جاتا ہے۔ حدیثِ علی کے متون میں بعض پہلوؤں سے جو باہمی اختلافات و تضادات پائے جاتے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے کہ اِس کے بعض متون سے معلوم ہوتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے صلاۃ التسبیح کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد سنا تھا اور پھر اُس قولی حدیث کو بعض لوگوں نے اُن سے آگے بیان کیا۔ اور بعض روایتوں میں حضرت علی ہی سے مروی ہے کہ یہ نماز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اُن کو بہ طور تحفہ و عطیہ بتائی اور سکھائی تھی، جب کہ بعض متون کے مطابق خود علی رضی اللہ عنہ ہی بتا رہے ہیں کہ یہ نماز تحفہ و عطیہ کے طور پر دراصل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے بھائی جعفر رضی اللہ عنہ کو دی تھا۔ علاوہ ازیں، حدیثِ علی کے ایک متن میں آیا ہے کہ قیام میں تسبیح و تکبیر کا ورد سورت پڑھنے کے بعد کرنا ہے، جب کہ ایک دوسری روایت میں بیان ہوا ہے کہ یہ ورد قراءت فاتحہ سے بھی پہلے کرنا ہے۔ چنانچہ واضح ہوا کہ حدیثِ علی صلاۃ التسبیح کے اثبات کے لیے نہ متناً مستند ہے اور نہ سنداً قابلِ استدلال ہو سکتی ہے۔ اُصولِ روایت و درایت کی روشنی میں اِس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

8۔ حدیثِ عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ

صلاۃ التسبیح سے متعلق ایک حدیث عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس کے چند طرق حدیث و آثار کے مندرجہ ذیل صرف چار مصادر میں نقل ہوئے ہیں:

1۔ نسخة أبي مسهر، أبو مسهر عبد الاعلى بن مسهر الغسانی الدمشقی (المتوفی: 218ھ)، رقم 36۔

2۔ شعب الإيمان، أبو بكر أحمد بن الحسين الخراسانی البيهقی (المتوفی: 458ھ)، رقم 604۔

3۔ ذكر صلاة التسبيح، أبو بكر أحمد بن على الخطيب البغدادی (المتوفی: 463ھ)، رقم 19، 20، 21، 23۔

4۔ أمالی الاذكار فی فضل صلاة التسبيح، ابن حجر العسقلانی (المتوفی: 852ھ)، رقم 11۔

تیسری، پانچویں اور نویں صدی ہجری کے مندرجہ بالا چار مصادر کے سوا حدیث و آثار کے باقی تمام مصادرِ اصلیہ صلاۃ التسبیح کے باب میں حدیثِ عبداللہ بن عمرو کے ذکر سے بالکل خاموش ہیں۔

روایت کے متون اور اِن کے اضطرابات

ذیل میں پہلے ہم عبداللہ بن عمرو کی روایت کے متون کا جائزہ لیں گے، جس سے اِن کے مضامین، اِن میں پائے جانے والے اضطرابات اور باہمی تضادات بھی واضح ہوتے ہیں۔

الف۔ نسخۂ ابی مسہر، رقم 36 میں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی نسبت سے نقل ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمھیں ایک تحفہ اور ہدیہ نہ دوں؟ یہ بات آپ نے کس صحابی سے مخاطب ہو کر فرمائی، آغاز میں اِس بات کی کوئی وضاحت اِس متن میں بیان نہیں ہوئی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ یہ چار رکعتوں کی نماز ہے، جو اِس کا اہتمام کرے گا، اُس کے نئے، پرانے، صغیرہ، کبیرہ، غلطی سے سرزد ہونے والے اور جان بوجھ کر کیے گئے تمام گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ اِس طریق میں اِس نماز کے حالتِ قیام میں قراءتِ فاتحہ سے پہلے 15 مرتبہ اور قراءتِ سورہ کے بعد دس مرتبہ تسبیح، تحمید، تہلیل و تکبیر کا ورد کرنے کی ہدایت مذکور ہے۔ یہ بات، ظاہر ہے کہ صلاۃ التسبیح کے باب کی دوسری تمام روایتوں میں منقول طریقے سے مختلف و متصادم ہے۔ پھر اِس متن میں نماز کے باقی تمام مواقع پر یہی وِرد دس دس مرتبہ دہرانے کی تلقین آئی ہے، لیکن قعدے میں اِس ورد کے اہتمام کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے، جب کہ معلوم ہے کہ دوسری تمام روایتوں میں اِس نماز کے قعدوں میں بھی دس دس مرتبہ اِس ذکر و تسبیح کی تاکید مذکور ہے۔ چنانچہ واضح ہوا کہ اِس متن میں اِس موخر الذکر پہلو سے بھی نقص ہے۔ اِس کے بعد دل چسپ بات یہ ہے کہ اِس روایت کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اِس نماز کا طریقہ بتائے جانے کے بعد عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ عباس (رضی اللہ عنہ) نے کہا: ایسی (طویل) نماز کون پڑھ سکتا ہے؟ اُن کے اِس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس واقعے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم دراصل اپنے چچا سیدنا عباس سے مخاطب تھے اور اِس نماز کا تحفہ بھی وہ اُنھی کو دے رہے تھے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے آپ کی یہ گفتگو سنی تو روایت کر دی، ورنہ وہ خود اِس نماز کی تعلیم کے معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست مخاطب نہیں تھے۔ سیدنا

عباس کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا: یہ نماز ہفتے میں یا مہینے میں یا سال میں ایک مرتبہ پڑھ لی جائے اور نمازی چاہے تو اِس میں سورۂ اخلاص بھی پڑھ سکتا ہے۔

ب۔ ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 21 اور ''شعب الایمان''، بیہقی، رقم 604 کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے در اصل عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہی کو مخاطب کر کے اُنھیں چار رکعتوں والی اِس نماز کا تحفہ دیا تھا۔ اِن دونوں روایتوں میں اِس نماز کا طریقہ اور اِس کی فضیلت بھی اُنھی الفاظ بیان ہوئی ہے جو اوپر ''نسخۂ ابی مسہر''، رقم 36 میں بیان ہوئی ہے۔ قعدے میں ذکر و تسبیح کے ورد کا اِن دونوں روایتوں میں بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ اِن متون کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اِس نماز کا تحفہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کو دیے جانے کے موقع پر عباس رضی اللہ عنہ بھی چونکہ وہاں موجود تھے، اِس لیے اُنھوں نے آپ کا یہ ارشاد سنا تو اِس پر یہ تبصرہ کیا کہ ایسی (طویل) نماز پڑھنے کا حوصلہ کون کر سکتا ہے؟ کہتے ہیں کہ یہ سن کر آپ نے فرمایا: یہ نماز ہفتے میں یا مہینے میں یا سال میں ایک مرتبہ بھی پڑھی جا سکتی ہے اور آپ چاہیں تو اِس میں سورۂ اخلاص بھی پڑھ سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ پچھلی روایت کے الفاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل مخاطب سیدنا عباس معلوم ہو رہے تھے، جب کہ اِس روایت کے مطابق آپ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے ہم کلام تھے۔

ج۔ ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 19 میں عبد اللہ بن عمرو سے جو روایت نقل ہوئی ہے، اُس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چار رکعت نماز کی وصیت و ترغیب کا عمومی ذکر ہے۔ اِس متن میں کسی متعین صحابی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مخاطبت کا کوئی ذکر ہے، نہ اِس نماز کے کسی کو بہ طور تحفہ و عطیہ دیے جانے کے کوئی الفاظ روایت ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں، پچھلی روایت کے متن کے برخلاف اِس میں حالتِ قیام میں صرف قراءت کے بعد پندرہ مرتبہ تسبیحات کا ورد کرنے کی تلقین ہے۔ اِس طریق میں قراءت سے قبل کسی وِرد و تسبیح کی تلقین بیان نہیں ہوئی ہے۔ مزید برآں، اِس متن میں بھی حسبِ سابق یہ نقص پایا جاتا ہے کہ قعدے میں تسبیحات کے ورد کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اِس روایت میں اِس نماز کی فضیلت کے الفاظ بھی کچھ مختلف ہیں اور وہ یہ ہیں: 'یغفر لہ ما قدم وما أخر، وما أسر وما أعلن'، ''یہ نماز پڑھنے والے کے اگلے، پچھلے، علانیہ اور خفیہ طور پر کیے ہوئے گناہ بخش دیے جائیں گے''۔

د۔ ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 20 کے متن میں یہ بیان ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ طور عطیہ یہ نماز خود عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو تعلیم فرمائی تھی۔ اِس موقع پر سیدنا عباس کی موجودگی اور اُن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمے کا اِس روایت میں کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ باقی مکمل نماز کا طریقہ اِس روایت میں اُسی طرح مذکور ہے، جس طرح پہلے اکثر روایتوں میں بیان ہو چکا ہے۔ آخر میں اِس نماز کے صلے میں نئے، پرانے، صغیرہ اور کبیرہ تمام گناہوں کی معافی کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔

ہ۔ ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 23 اور ''امالی الاذکار فی فضل صلاۃ التسبیح''، ابن حجر، رقم 11 میں عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز دراصل جعفر (رضی اللہ عنہ) کو مخاطب کر کے تحفے کے طور پر اُنھیں بتائی اور سکھائی تھی اور آپ نے اُنھی سے فرمایا تھا کہ یہ نماز تم دن میں یا رات میں کسی وقت پڑھ لینا یا ہر جمعے کے دن ادا کر لینا یا مہینے میں ایک مرتبہ یا سال میں ایک مرتبہ پڑھ لینا۔ اِس کے بعد اِس روایت میں اِس نماز کا وہی طریقہ بیان ہوا ہے جو زیادہ تر روایتوں میں پہلے بیان ہوا ہے۔ ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 23 کے مطابق آخر میں آپ نے جعفر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ 'یغفر اللہ لك ذنوبك ما أسررت وما أعلنت'، ''اِس نماز کے صلے میں اللہ تعالیٰ آپ کے علانیہ اور مخفی گناہ بخش دیں گے''۔

تحقیقِ اسانید

الف۔ ''نسخۂ ابی مسہر''، رقم 36، ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 21 اور ''شعب الایمان''، بیہقی، رقم 604 کی اسانید میں مندرجہ ذیل دو بڑی علل پائی جاتی ہیں:

1۔ اِن اسانید میں ابو جناب یحییٰ بن ابی حیۃ الکلبی الکوفی نامی ایک راوی ہے، جس کو اکثر ائمۂ رجال نے 'ضعیف' اور 'مدلس' قرار دیا ہے۔ بعض محدثین نے اِس کو 'منکر الحدیث' اور بعض نے 'متروک الحدیث' بھی کہا ہے۔[7]

---

[7]۔ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مزی 31/284-290، رقم 6817۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر

2۔ اِن تینوں اسانید میں ابو جناب یحییٰ نے یہ روایت 'عن' کے حرف کے ساتھ بیان کی ہے، اِس نے اپنے شیخ ابو الجوزاء سے اِس کے سننے کی صراحت نہیں کی ہے۔ چنانچہ اِس پہلو سے بھی یہ روایت ناقابل اعتبار ہے، اِس لیے کہ مدلّس راوی کے بارے میں محدثین کا یہ ضابطہ معلوم ہے کہ وہ جب تک کسی روایت کو بیان کرنے میں اپنے شیخ سے سننے کی صراحت نہیں کرتا، اُس کی 'مُعَنعَن' روایت غیر مقبول ہو گی۔

3۔ اِن تینوں طرق میں محمد بن حمید التمیمی الرازی نامی ایک راوی بھی ہے، جس کو بعض ائمۂ رجال نے 'ضعیف'، بعض نے 'ضعیف جدًا'، بعض نے 'منکر الحدیث'، بعض نے 'متروک الحدیث' اور کئی علماے حدیث نے اِس کو 'کذاب' قرار دیا ہے۔[8]

ب۔ ''امالی الاذکار فی فضل صلاۃ التسبیح''، ابن حجر، رقم 11 کی سند میں درجِ ذیل کئی علتیں پائی جاتی ہیں:

1۔ اِس سند میں حافظ ابن حجر یہ روایت محمد بن احمد الشہرزوری نامی راوی سے نقل کر رہے ہیں جو ائمۂ حدیث و رجال کے نزدیک ایک 'مجہول'، یعنی نامعلوم راوی ہے۔ تراجمِ رجال کے مراجع اِس راوی کے تعارف سے بالکل خاموش ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ فنِ حدیث کی رو سے مجہول راوی کی روایت 'منقطع' و 'ضعیف' قرار دی جاتی ہے۔

2۔ اِسی سند میں ابن المقیر علی بن ابی عبد اللہ الازجی نامی ایک راوی ہے، جو حدیث کے راویوں میں چھبیسویں طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور اِس کی پیدایش 545ھ کی ہے۔ اِس سند میں یہ شخص جس راوی سے یہ روایت نقل کر رہا ہے، اُس کا نام ابن الغریق محمد بن علی القرشی ہے اور یہ رواۃِ حدیث کے انیسویں طبقے کا راوی ہے، جس کی وفات 465ھ میں ہو چکی تھی۔ اِس سے واضح ہے کہ یہاں بھی یہ سند 'منقطع'، یعنی ٹوٹی ہوئی ہے؛ ابن المقیر کی ابن الغریق سے روایت کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتی، اِس لیے کہ ابن الغریق کی وفات ابن المقیر کی پیدایش سے 80 سال پہلے ہو چکی تھی۔

11/201-203، رقم 340۔

[8] ۔ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مزی 25/97-108، رقم 5167۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر 9/127-131، رقم 181۔

3۔ اِس کے علاوہ اِس سند میں اوپر محمود بن خالد السلمی نامی راوی جس شخص سے اِس روایت کو نقل کر رہا ہے، اُس کا نام ذکر نہیں کیا، بلکہ محمود بن خالد نے ابہام رکھ کر کہا ہے کہ 'عن الثقة'، یعنی یہ روایت ثقہ راوی سے منقول ہے۔ یہ ثقہ کون تھا، اِس کی صراحت محمود نے نہیں کی۔ اِس طرح محض اپنی توثیق کے ساتھ مبہم راوی کا ذکر کرنا فنِ حدیث کی رو سے کسی بڑے حافظ و محدث سے بھی صادر ہو تو غیر مقبول ہوتا ہے۔ چنانچہ اِس مبہم راوی کی وجہ سے اِس مقام پر بھی سند کا انقطاع بالکل واضح ہے۔

4۔ اِسی سند میں ایک راوی عبد الرحمٰن بن ثابت بن ثوبان العنسی ہے، جسے امام یحییٰ بن معین اور امام نسائی سمیت کئی ائمۂ محدثین نے 'ضعیف' قرار دیا ہے، جب کہ امام احمد نے اِس کی احادیث کے 'منکر' ہونے کی صراحت کی ہے۔[9]

ج۔ ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 19 کی سند میں غیاث بن المسیب الراسبی نامی راوی مجہول ہے، چنانچہ یہ سند بھی غیر متصل و مردود ہے۔[10]

د۔ ذکر صلاۃ التسبیح، خطیب بغدادی، رقم 20 کی سند میں مندرجہ ذیل دو بڑی خرابیاں ہیں:

1۔ اِس میں عبد العزیز بن ابان القرشی نامی راوی ہے، جسے کئی ائمۂ حدیث نے 'کذاب' اور 'وضاع' قرار دیا ہے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اُن کے نزدیک یہ ایک بالکل 'متروک' راوی ہے۔[11]

2۔ اِس سند میں ایک راوی ابان بن ابی عیاش البصری ہے، جو ائمۂ رجال کے نزدیک 'متروک الحدیث' ہے اور روایتِ حدیث میں اِس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔[12]

ہ۔ ''ذکر صلاۃ التسبیح''، خطیب بغدادی، رقم 23 کی سند میں درجِ ذیل علتیں ہیں:

---

[9]۔ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مزی 17/12-18، رقم 3775۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر 6/150-151، رقم 306۔

[10]۔ میزان الاعتدال فی نقد الرجال، الذہبی 4/27-28، رقم 8131۔

[11]۔ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مزی 18/107-113، رقم 3434۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر 6/294-295، رقم 637۔

[12]۔ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مزی 2/19-24، رقم 142۔

1۔ اِس میں امام ابو داؤد کا بیٹا ابو بکر عبد اللہ بن سلیمان بن الاشعث ہے، جس کے بارے میں خود امام ابو داؤد نے کہا ہے کہ میرا یہ بیٹا 'کذاب' ہے۔ یہی رائے اِس کے بارے میں حافظ ابراہیم اصبہانی نے بیان کی ہے۔ امام ابن عدی کے شیخ یحییٰ بن محمد بن صاعد نے کہا ہے کہ اِس کے بارے میں اِس کے والد ابو داؤد کی بات ہمارے لیے کافی ہے کہ 'میرا یہ بیٹا کذاب ہے'، چنانچہ اِس سے کوئی حدیث نہ لو۔[13]

2۔ اِس سند میں بھی عبد الرحمٰن بن ثابت بن ثوبان العنسی موجود ہے، جسے امام یحییٰ بن معین اور امام نسائی سمیت کئی ائمۂ محدثین نے 'ضعیف' قرار دیا ہے، جب کہ امام احمد نے اِس کی احادیث کو 'منکر' بتایا ہے۔[14]

4۔ اِس کے علاوہ، اِس سند میں یہ موخر الذکر راوی جس شخص سے اِس روایت کو نقل کر رہا ہے، اُس کا نام بھی اِس نے نہیں بتایا، بلکہ مبہم رکھ کر کہا ہے کہ 'حدثنی الثقة'، ''ثقہ راوی نے مجھ سے یہ روایت بیان کی ہے''۔ قواعدِ علمِ روایت کے مطابق راوی کو مبہم رکھ کر خود سے ایسی توثیق کر لینا قطعاً قابل قبول نہیں ہے، خواہ علمِ حدیث کا کوئی بڑا امام ہی ایسا کیوں نہ کرے۔ اِس مبہم راوی کی وجہ سے اِس مقام پر سند کا انقطاع بھی بالکل واضح ہے۔

روایت کی حیثیت اور اِس کا حکم

مندرجہ بالا تحقیق و مطالعہ سے متحقق ہوا کہ صلاۃ التسبیح کے باب میں عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی نسبت سے مروی قولی حدیث کا استناد بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔ اصولِ روایت کی روشنی میں اِس حدیث کے بعض طرق کی اسانید متعدد علل کی وجہ سے بالکل واہی اور انتہائی کم زور ہیں، جب کہ بعض من گھڑت بھی ہیں۔ سند کے علاوہ حدیثِ ابن

---

[13]۔ تاریخ بغداد، خطیب البغدادی 22/115-116۔ الضعفاء والمتروکون، ابن الجوزی 2/126، رقم 2040۔

[14]۔ تہذیب الکمال فی اسماء الرجال، مزی 17/12-18، رقم 3775۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر 6/150-151، رقم 306۔

عمرو اپنے متون کے بعض اختلافات واضطرابات کی وجہ سے بھی بالکل ناقابلِ اعتبار ہے۔ اِس کے بعض طرق متن کے اعتبار سے بھی 'منکر' ہیں، اِس لیے کہ اُن میں صلاۃ التسبیح کے باب کی دوسری روایتوں سے صریح اختلاف پایا جاتا ہے۔ اِسی طرح اِس حدیث کے متون میں بعض پہلوؤں سے باہمی اختلافات وتضادات بھی بالکل صریح طور پر دیکھے گئے ہیں۔ بعض متون سے معلوم ہوتا ہے کہ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے صلاۃ التسبیح کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک عمومی ارشاد سنا اور پھر اِس کو روایت کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ نماز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر ابن عمرو رضی اللہ عنہ ہی کو بہ طور تحفہ وعطیہ بتائی اور سکھائی تھی، بعض متون سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس واقعے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب سیدنا عباس رضی اللہ عنہ تھے، جب کہ ایک طریق کے مطابق خود ابن عمرو نے بہ صراحت بتایا ہے کہ یہ نماز نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر رضی اللہ عنہ کو تعلیم فرمائی تھی، یعنی اِس واقعے میں آپ کے مخاطب در اصل حضرت جعفر تھے۔ اِس حدیث کے بعض طرق میں یہ نکارت بھی ہے کہ اُن میں قیام میں قراءت فاتحہ سے قبل 15 مرتبہ اور تلاوتِ سورہ کے بعد 10 مرتبہ تسبیح وتکبیر کے ورد کا حکم ہے۔ یہ بات، ظاہر ہے کہ صلاۃ التسبیح کے باب کی دوسری تمام روایتوں میں منقول طریقے سے مختلف و متصادم ہے، جب کہ اِسی روایت کے بعض طرق میں حالتِ قیام میں صرف قراءت کے بعد پندرہ مرتبہ تسبیحات کا ورد کرنے کی تلقین مذکور ہے، لیکن قراءت سے پہلے کسی وِرد و تسبیح کا ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ واضح ہوا کہ صلاۃ التسبیح کے اثبات کے لیے حدیثِ عبد اللہ بن عمرو بھی نہ سنداً قابلِ التفات ہو سکتی ہے اور نہ متناً قابلِ استدلال۔ اُصولِ روایت ودرایت کی روشنی میں اِس حدیث کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

[باقی]

محمد سعد سلیم

علامات قیامت اور تاریخی واقعات:
بائیبل اور قرآن کی روشنی میں

(9)

["نقطۂ نظر" کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

دجال کی تلاش—سوویت چالوں کی کھوج (1946ء سے)

حدیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دجّال کو تلاش کرنا[1] اِس بات کی علامت ہے کہ سرد جنگ کے دوران میں امریکہ نے سرگرمی سے کمیونسٹ سرگرمیوں کی نشان دہی کرنے، اُن کے اثر ورسوخ اور کم زوریوں کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ بعض مواقع پر اُس نے اِن کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے فوجی اور خفیہ طاقت کا استعمال بھی کیا۔

1۔ مسلم، رقم 2937۔

دجّال کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی پگھل جانا—کیوبا میزائل بحران کے بعد سوویت یونین کی معاشی کم زوری (اکتوبر 1962ء سے آگے)

حدیث میں آتا ہے کہ دجّال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھ کر پگھل جائے گا، جیسے نمک پانی میں پگھل جاتا ہے۔[2]

اِس حدیث کی ایک مماثلت کیوبا میزائل بحران سے جوڑی جاسکتی ہے، جو سرد جنگ کا وہ واحد لمحہ تھا جب امریکہ اور سوویت یونین براہِ راست آمنے سامنے آئے۔

اِس ٹکراؤ کا نتیجہ سوویت فتح نہیں تھا، بلکہ اُس کی ساختی کم زوریوں کا انکشاف تھا۔ کیوبا میں ایٹمی میزائل نصب کرنے کا اقدام دراصل اِس بات کا اعتراف تھا کہ سوویت یونین کے پاس وہ طویل فاصلے تک مار کرنے کی صلاحیت نہیں تھی جو امریکہ کو پہلے ہی بین البرّاعظمی میزائلوں اور اسٹریٹیجک بمبار طیاروں کے ذریعے سے حاصل تھی۔ کیوبا پر امریکی بحری ناکا بندی نے سوویت بحریہ کی کم زوری کو مزید بے نقاب کیا، جو امریکی بحری طاقت کو چیلنج کرنے کے قابل نہ تھی۔ معاشی طور پر بھی سوویت یونین کم زور تھا، کیونکہ اُس کا سخت گیر نظام طویل تنازع برداشت نہیں کر سکتا تھا، جب کہ امریکی معیشت لچک دار اور حالات کے مطابق بڑھنے کی اہل تھی۔ سیاسی طور پر، بحران کے حل نے سوویت یونین کی کم زوری کو نمایاں کر دیا۔ اگرچہ سوویت یونین نے ترکی سے امریکی میزائلوں کے انخلا کے ذریعے سے خاموشی سے ایک رعایت حاصل کی، مگر عوامی تاثر ایک پسپائی کا تھا۔ سوویت یونین کی عظیم طاقت کی برابری کا تاثر ٹوٹ گیا اور پروپیگنڈے اور حقیقت کے درمیان خلیج سب پر عیاں ہو گئی۔

اِس کے جواب میں، سوویت قیادت نے دوبارہ ایسی ذلت سے بچنے کے لیے فوجی صلاحیتوں پر بھاری سرمایہ کاری کی۔ تاہم یہ کوشش وسیع وسائل کو چوسنے کا باعث بنی اور یوں سوویت یونین بہ تدریج ''پگھلنا'' شروع ہو گیا—ایک ایسا عمل جو حدیث میں دجّال کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی گھلنے کی علامتی تصویر سے مشابہ ہے۔

2۔ مسلم، رقم 2897۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نیزے پر دجّال کا خون—امریکی اسلحے کے ذریعے سے افغانستان میں سوویت نقصانات (1986ء–1989ء)

حدیث کے مطابق، اگر اللہ دجّال کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتا تو وہ آہستہ آہستہ پگھل کر فنا ہو جاتا، لیکن اللہ نے یہ طے کیا کہ دجّال کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجّال کا خون اپنے نیزے پر لوگوں کو دکھائیں گے۔[3]

نیزے پر خون کا یہ منظر 1980ء کی دہائی کی افغان جنگ میں ایک واضح مماثلت پاتا ہے۔ ابتدا میں مجاہدین نے سوویت یلغار کا مقابلہ زیادہ تر قبضہ شدہ یا خفیہ طور پر فراہم کردہ سوویت اسلحے سے کیا، جو CIA کے ذریعے سے اِس طرح پہنچایا گیا کہ امریکی کردار پوشیدہ رہے۔ بعد میں امریکہ نے اپنا جدید اسلحہ فراہم کیا—سب سے مشہور "اسٹنگر میزائل" (Stinger missile) —جو سوویت فضائی طاقت کو چیرنے والا حقیقی "نیزہ" ثابت ہوا۔ اِس نیزے پر خون صرف طیاروں اور فوجیوں کے نقصان کی علامت نہ تھا، بلکہ اُس سے کہیں گہرا مطلب رکھتا تھا: سوویت یونین کے حوصلے، معیشت اور جنگی عزم کا زوال۔ سوویت ہیلی کاپٹروں کو آسمان سے گرتے دیکھنا اِس جنگ کا ٹرننگ پوائنٹ بن گیا، اور اِسی کے ساتھ سوویت ساکھ بھی بکھرنے لگی۔

تاہم، جیسا کہ حدیث خود اشارہ کرتی ہے، اگر یہ ہتھیار کبھی فراہم نہ بھی کیے جاتے تو بھی سوویت یونین اپنی داخلی کم زوریوں اور معاشی ناکامیوں کے بوجھ تلے پہلے ہی پگھل رہا تھا۔ نیزہ صرف اِس عمل کو تیز کرنے اور اُس کی قیمت کو دنیا کے سامنے ظاہر کرنے کا ذریعہ بنا اور یوں امریکی ہتھیار سوویت شکست کی علامت بن گئے۔

بابِ لُد پر دجّال کو پکڑنا اور قتل کرنا—سوویت نظام پر امریکی دباؤ اور دیوارِ برلن کے گرنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی اجارہ داری کا خاتمہ (1989ء–1990ء)

احادیث کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجّال کو "لُد کے دروازے پر پکڑیں گے اور قتل

3۔ مسلم، رقم 2897۔

کریں گے۔"[4]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں لُدباز نطینی سلطنت کا ایک اہم تجارتی اور انتظامی مرکز تھا۔ یہ مقام تجارتی راستوں اور فوجی شاہراہوں کے سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے اُس خطے میں غیر معمولی اسٹریٹیجک اہمیت رکھتا تھا۔ بالکل اُسی طرح، 1989ء میں برلن — خاص طور پر دیوارِ برلن — سرد جنگ کا ایک مرکزی اور علامتی نکتہ بن چکا تھا، جہاں دو متضاد نظام آمنے سامنے کھڑے تھے۔ مغربی برلن سرمایہ دارانہ کامیابی اور آزاد معاشرے کی علامت بن گیا تھا، جب کہ مشرقی برلن، جو سوویت بلاک کے زیرِ اثر تھا، کمیونزم کی نظریاتی سرحدوں کی نمایندگی کرتا تھا۔ امریکہ اور اُس کے اتحادیوں نے مغربی برلن کو سرمایہ دارانہ ترقی کا شوکیس بنا دیا، جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا معاشی فرق سوویت یونین کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا۔

1989ء میں دیوارِ برلن کا گرنا نہ صرف سوویت اثر و رسوخ کے زوال کی علامت تھا، بلکہ یہ وہ لمحہ بھی تھا جب امریکہ نے موثر طور پر کمیونزم کو "پکڑ لیا" اور اُسے نظریاتی و سیاسی طور پر گھیر لیا۔ امریکہ نے سوویت یونین کے صدر، گورباچوف (Gorbachev) کے ساتھ سفارتی روابط کو مزید گہرا کیا اور کثیر الجماعتی جمہوریت اور معاشی اصلاحات پر زور ڈالا۔ نیٹو نے مشرقی یورپ میں اپنی سیاسی رسائی کو وسیع کیا اور سابقہ سوویت ریاستوں کو ماسکو کے اثر سے دُور لے گیا۔ اُسی وقت، امریکی مالیاتی اداروں نے معاشی اصلاحات کو فروغ دیا، جب کہ امریکی میڈیا اور ثقافتی اثر و رسوخ نے یورپ بھر میں آزادی کی لہر کو تقویت بخشی۔ خفیہ اداروں نے بھی سوویت ریاستوں کے اندر قوم پرستانہ رجحانات کو ابھارا، جس سے مرکزی کنٹرول مزید کم زور ہوا۔

1990ء تک، امریکہ کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے نتیجے میں کمیونسٹ پارٹی کی آئینی اجارہ داری کا خاتمہ ہو گیا — جو 1917ء سے سوویت اقتدار کی ریڑھ کی ہڈی تھی۔ یہ فیصلہ کن لمحہ علامتی طور پر دجّال کے "قتل" کی نمایندگی کرتا ہے، جیسا کہ احادیث میں پیشین گوئی کی گئی تھی۔ بالآخر 1991ء میں خود سوویت یونین ٹوٹ گیا اور کمیونزم بہ طور عالمی نظریہ تاریخ کا حصہ بن گیا۔

4۔ مسلم، رقم 297۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا محفوظ شدہ قوم پر رحمت فرمانا—مغربی برلن اور متحدہ جرمنی کا اعتراف (1990ء)

حدیث کے مطابق، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسی قوم کے پاس جائیں گے جو دجّال کے فتنہ سے محفوظ رہی ہوگی۔ آپ اُن پر شفقت فرمائیں گے، اُن کے چہروں پر دستِ رحمت رکھیں گے اور اُنھیں جنت میں اُن کے مراتب سے آگاہ کریں گے۔[5]

یہ منظر مغربی برلن کی قسمت سے مماثلت رکھتا ہے۔ کئی دہائیوں تک اُس کی عوام نے دباؤ، تنہائی اور سوویت بلاک کی طرف سے مسلسل خطرات کو جھیلا، مگر وہ ثابت قدم رہے۔ مغربی برلن استقامت کی ایک زندہ مثال بنا رہا، جو دیوارِ برلن کے حصار کے باوجود کمیونزم کی لپیٹ میں آنے سے محفوظ رہا۔

جب 1989ء میں دیوارِ برلن گر گئی تو جرمن اتحاد کو ہر طرف سے یکساں پذیرائی نہ ملی۔ برطانیہ اور فرانس نے ہچکچاہٹ ظاہر کی، اُنھیں خدشہ تھا کہ کہیں یورپ میں دوبارہ جرمن غلبہ نہ ابھر آئے۔ اُس کے برعکس، امریکہ نے اتحاد کی بھرپور اور غیر مبہم حمایت کی۔ اُس نے اپنے اتحادیوں کو یقین دہانی کرائی، سفارتی دباؤ ڈالا، اور اِس بات پر زور دیا کہ جرمنی نیٹو (NATO) اور یورپی برادری میں ضم رہے گا۔ یوں امریکہ نے مغربی برلن کی دہائیوں پر محیط ثابت قدمی کو ایک بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ کامیابی میں بدل دیا۔ اِسی اعتبار سے، حدیث میں ایک محفوظ شدہ قوم پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شفقت کی جو تصویر پیش کی گئی ہے، وہ جرمنی پر امریکی اعتراف اور تائید کی صورت میں جھلکتی ہے، جب وہ ایک نئے دور میں داخل ہوا، جس کی بنیاد اتحاد اور خوش حالی پر تھی۔

دجال کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیچھے کعبہ کا طواف کرنا—سرد جنگ میں عالمی برتری کی کوشش (1946ء–1991ء)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خانہ کعبہ کا طواف

5۔ مسلم، رقم 2937۔

کرتے ہوئے دیکھا، جب کہ دجال اُن کے پیچھے چل رہا تھا۔[6]

اِس خواب میں علامتی طور پر امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان سرد جنگ کا خلاصہ بیان ہوا ہے۔ یہاں کعبہ عالمی طاقت کے مرکز کی نمایندگی کرتا ہے، بالکل اُسی طرح، جیسے اسلامی روایت میں یہ خدا کے گھر کے طور پر مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح مسلمان خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کعبہ کا طواف کرتے ہیں، اُسی طرح اِس خواب میں طاقت کے اِس علامتی مرکز کا طواف عالمی غلبے کی جستجو کو ظاہر کرتا ہے۔

اِس حدیث کی علامتی تعبیر سرد جنگ کے دوران میں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان عالمی طاقت کے مقابلے کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امریکہ کی نمایندگی کرتے ہیں، جو عالمی قیادت سنبھالے ہوئے تھا، جب کہ دجّال سوویت یونین کی علامت ہے، جو ہمیشہ امریکہ کے پیچھے رہ کر برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن ناکام رہا۔ کعبہ کا طواف امریکہ اور سوویت یونین کے عالمی اثر ورسوخ کی علامت ہے، جہاں امریکہ نے اپنی برتری قائم رکھی۔

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور دجّال کا طواف کے دوران میں براہِ راست ایک دوسرے سے نہ لڑنا اِس حقیقت کی علامت ہے کہ سرد جنگ کے دوران میں امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان جتنی بھی جھڑپیں یا معرکے ہوئے، وہ سب بالواسطہ تھے، براہِ راست جنگ کبھی نہ ہوئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دو آدمیوں کے کندھوں پر سہارا لے کر طواف کرنا سرد جنگ کے دوران میں امریکہ کے اہم اتحادیوں، یعنی برطانیہ اور مغربی جرمنی، کی حکمتِ عملی کے تحت صف بندی اور فیصلہ کن سیاسی حمایت کی علامت ہے۔

[باقی]

6۔ بخاری، رقم 5902۔

ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن

مطالعۂ مسندِ احمد

(مسندِ احمد کی احادیث سے متعلق استفسارات اور ان کا جواب)

(5)

مسند عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مطیع سید: حضرت عمر کے متعلق عام طور پر بتایا جاتا ہے کہ وہ کثرت روایت کے قائل نہیں تھے، لیکن ان کی روایات کی تعداد حضرت ابو بکر کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زیادہ عرصہ آپ کے بعد زندہ رہے؟

عمار ناصر: جی، ایسا ہی ہے۔ وہ چودہ پندرہ سال زندہ بھی رہے اور ان کے عہد خلافت میں بہت سے ایسے معاملات بھی ان کے سامنے آئے جن میں حضرت عمر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی تلاش اور تحقیق کرنی پڑی یا بہت سی احادیث جو ان کے علم میں تھیں، وہ بیان کرنی پڑیں۔ اس لیے بدیہی طور پر ان کی مرویات کی تعداد زیادہ ہے۔

مطیع سید: بعض احادیث سے حضرت عمر واقف نہیں تھے، حالاں کہ وہ صحابہ میں بہت معروف تھیں۔ جیسے انھوں نے ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے یہ حدیث سنی کہ کسی کے گھر جا کر تین دفعہ اجازت مانگنی چاہیے اور کوئی جواب نہ ملے تو واپس چلے جانا چاہیے۔ اس پر حضرت عمر نے ان سے کہا کہ اس پر کوئی گواہ لے کر آؤ، ورنہ میں سزا دوں گا (ترمذی، رقم 2690)۔ یہ تو

روز مرہ کے آداب زندگی سے متعلق ایک حدیث تھی، حضرت عمر اس سے کیسے ناواقف رہے؟ وہ تو ہر وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے۔

عمار ناصر: ایسا ہو جانا بعید تو نہیں۔ بعض دفعہ بہت قریبی تعلق رکھنے والے بھی کسی اہم بات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ویسے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اہتمام تو کرتے تھے کہ آپ نے ان کی غیر موجودگی میں جو اہم باتیں ارشاد فرمائی ہوں، ان کے علم میں آتی رہیں۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ باری تقسیم کی ہوئی تھی۔ ایک دن حضرت عمر تجارت وغیرہ کے معاملات کو دیکھتے تھے اور ان کا ساتھی مسجد نبوی میں حضور کے ساتھ رہتا تھا۔ دوسرے دن وہ تجارت کو دیکھتا تھا اور حضرت عمر آپ کے ساتھ رہتے تھے اور پھر دونوں ایک دوسرے کو اہم باتوں کی خبر دے دیا کرتے تھے (بخاری، رقم 89)۔ اس کے باوجود کچھ اہم باتیں ان کے علم میں نہ آئی ہوں تو یہ بعید از امکان نہیں۔

مطیع سید: شام سے کچھ لوگ آئے اور حضرت عمر سے کہا کہ ہمارے پاس گھوڑے اور غلام ہیں اور ہم ان کی زکوٰۃ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ یہ کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر نے نہیں کیا، اس لیے میں صحابہ سے اس کے متعلق مشورہ کروں گا۔ پھر حضرت علی نے مشورہ دیا کہ اگر یہ ان پر مستقل طور پر لازم نہ کی جائے جو آپ کے بعد بھی ان سے وصول کی جاتی رہے تو پھر ان سے زکوٰۃ لے لیں (رقم 82)۔ اس سے تو ایسا لگتا ہے کہ صحابہ نے وقتی طور پر ان کی زکوٰۃ وصول کی، مستقل طور پر زکوٰۃ عائد کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا وہ زکوٰۃ کے حکم کو کچھ خاص اموال تک محدود سمجھتے تھے؟

عمار ناصر: یہ اچھا سوال ہے، اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ اجتہاد اور قیاس کا عمل امت میں کیسے آگے بڑھا ہے۔ اگر آپ قرآن کے الفاظ کو دیکھیں تو اس میں عموم ہے: 'خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً'، ''تم اُن کے مالوں کا صدقہ قبول کر لو'' (التوبہ 9:103)۔ اس میں کسی خاص مال کی تعیین نہیں ہے۔ قیاساً بھی دیکھا جائے تو ہر طرح کے مال میں زکوٰۃ ہونی چاہیے۔ لیکن ہماری فقہی روایت اس نتیجے تک ایک دم نہیں پہنچ گئی، بلکہ کچھ اجتہادی مراحل سے گزر کر یہ موقف اختیار کیا گیا ہے۔ اصل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور میں جن چیزوں کی زکوٰۃ وصول کی، وہ تو وہی اموال تھے، جو اس وقت عرب کے لوگوں کے پاس عموماً ہوتے تھے۔ آپ نے سونا

چاندی کی، زرعی پیداوار کی اور مواشی میں سے اونٹوں، گایوں اور بکریوں کی زکوٰۃ وصول کی، لیکن گھوڑے اور غلام کے متعلق فرمایا کہ میں نے ان کی زکوٰۃ معاف کر دی ہے۔ زرعی پیداوار میں بھی آپ نے سبزیوں اور ترکاریوں کی زکوٰۃ نہیں لی، صرف کھجور اور گندم اور جو وغیرہ کی زکوٰۃ لی۔

اس پس منظر میں صحابہ اور تابعین کے ہاں عام رجحان یہی تھا کہ زکوٰۃ اصلاً مال کی انھی اقسام پر عائد کی گئی ہے۔ حضرت عمر اور حضرت علی کے اس مکالمے میں بھی یہی رجحان جھلک رہا ہے۔ روایات میں ہے کہ انھوں نے اہل شام کے گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ ان کے اصرار پر قبول تو کر لی، لیکن بدلے میں ان کے غلاموں کے لیے بیت المال سے وظیفہ بھی جاری کر دیا (الاموال، ابو عبید، رقم 1365، 1366)۔ پھر زرعی پیداوار کی بھی جو نئی اقسام سامنے آئیں، ان کے متعلق صحابہ و تابعین میں اختلاف رائے رہا کہ ان سے زکوٰۃ لینی چاہیے یا نہیں۔ بعض فقہا کی رائے یہ تھی کہ صرف ان اصناف کی زکوٰۃ لینی چاہیے، جن کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لی ہے، لیکن دوسرے فقہا نے دوسری اجناس، مثلاً مکئی، زیتون، چاول اور دالوں وغیرہ کی بھی زکوٰۃ لینے کو درست قرار دیا۔ پہلے دور میں فقہا کے مابین یہ اختلاف عموماً قائم رہا ہے۔ ایک بڑے گروہ کی یہی رائے تھی اور آپ تیسری صدی میں ''کتاب الاموال'' کے مصنف امام ابو عبید کو دیکھیں تو ان کا رجحان بھی یہی تھا کہ زکوٰۃ صرف ان خاص اموال میں ہے، جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لی، ان کے علاوہ باقی اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

مطیع سید: قیاس کے مطابق تو یہی بات لگتی ہے کہ ہر طرح کے مال میں زکوٰۃ ہونی چاہیے۔ جو فقہا صرف خاص اموال میں زکوٰۃ کے قائل تھے، کیا وہ قیاس کو درست نہیں سمجھتے تھے؟ اگر وہ قیاس کو مانتے تھے تو پھر کس بنیاد پر یہ رائے رکھتے تھے؟

عمار ناصر: نہیں، ان کی رائے کی وجہ قیاس کا انکار نہیں۔ قیاس کو تو وہ مانتے تھے، لیکن اس خاص مسئلے میں ان کا اختلاف اس نکتے میں تھا کہ زکوٰۃ کے واجب ہونے کی بنیادی علت شریعت کی نظر میں کیا ہے؟ اگر تو یہ صرف مال ہونا ہے تو پھر ہر مال میں زکوٰۃ ہونی چاہیے، لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مختلف قسم کے اموال میں سے کچھ خاص اقسام کی زکوٰۃ وصول کی اور باقی کی نہیں کی، بلکہ صراحت سے فرمایا کہ میں ان کی زکوٰۃ معاف کرتا ہوں تو اس کا

مطلب یہ ہے کہ شریعت زکوٰۃ کو ان خاص اموال تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔ امام ابوعبید نے بعض اہل علم سے اس کی تعلیل یوں نقل کی ہے کہ شریعت کا مقصد دراصل فقرا اور مساکین کی خوراک کی ضرورت کو پورا کرنا ہے، اس لیے اس نے غذائی اجناس میں سے صرف گندم، جو اور کھجور کی اور جانوروں میں سے صرف اونٹوں، گایوں اور بکریوں کی زکوٰۃ مقرر کی ہے تاکہ غربا ان اجناس کو کھا کر اور جانوروں کا دودھ پی کر پیٹ بھر سکیں۔ چنانچہ یہ حضرات قیاس کے منکر نہیں تھے، لیکن اس حکم کی اصل علت کیا ہے؟ اس میں ان کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ بہر حال جیسے جیسے تمدن بدلتا چلا گیا اور اموال کی دوسری قسمیں زیادہ کارآمد اور اہم ہوتی چلی گئیں، فقہا میں بھی یہ رجحان زیادہ عام ہوتا چلا گیا کہ ہر قسم کے مال میں زکوٰۃ واجب ہے۔ جدید دور کے اہل علم میں تو ہر طرح کے اموال میں زکوٰۃ واجب ہونے پر تقریباً اتفاق ہے۔ یوسف القرضاوی صاحب کی ”فقہ الزکوٰۃ“ میں آپ اس بحث کو دیکھ سکتے ہیں۔

مطیع سید: بنو تغلب کا ایک عیسائی مسلمان ہوا اور اس نے حج اور عمرے کا اکٹھا احرام باندھ لیا۔ کسی نے اس کے اس عمل پر اسے بے وقوف قرار دیا۔ وہ پریشان ہو کر حضرت عمر کے پاس گیا تو انھوں نے فرمایا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں، تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہی کام کیا ہے (رقم 83)۔ لیکن دوسری طرف ان کے بارے میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ حج تمتع سے منع کرتے تھے۔ ایک طرف وہ اسے سنت تسلیم کر رہے ہیں اور دوسری طرف منع بھی فرماتے تھے؟

عمار ناصر: نہیں، یہ تو تمتع نہیں تھا، یہ قران تھا۔ قران میں عمرہ اور حج ایک ہی احرام سے ادا کیا جاتا ہے، عمرے کے بعد احرام کھولا نہیں جاتا۔ تمتع میں ایک ہی سفر میں پہلے عمرہ ادا کر کے احرام کھول لیا جاتا ہے اور اس کے بعد حج کا احرام الگ باندھا جاتا ہے۔ حضرت عمر حج تمتع سے منع کرتے تھے تاکہ لوگ درمیان میں احرام نہ کھولیں۔

مطیع سید: حضرت عمر حج میں مزدلفہ سے منیٰ کی طرف طلوعِ آفتاب سے قبل ہی روانہ ہو گئے اور وجہ یہ بتائی کہ مشرکین طلوعِ آفتاب کے بعد روانہ ہوتے تھے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت کی اور طلوع آفتاب سے پہلے مزدلفہ سے روانہ ہو گئے (رقم 84)۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتی مصلحت کے تحت مشرکین کی مخالفت کے لیے ایسا کیا تھا تو پھر حضرت عمر بعد میں اس پر اہتمام سے کیوں عمل کر رہے ہیں؟

عمار ناصر: نہیں، اس میں مشرکین کی مخالفت صرف ان سے امتیاز قائم کرنے کے لیے نہیں تھی۔ مزدلفہ سے طلوع آفتاب سے پہلے روانہ ہونے کا فیصلہ آپ نے دراصل زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی ایک خود ساختہ پابندی کی اصلاح کے لیے کیا تھا، یعنی مشرکین نے اپنی طرف سے ہی ایک پابندی عائد کی ہوئی تھی کہ سورج کے طلوع ہونے تک ہم مزدلفہ میں ہی رکیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرمائی کہ اس کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں، طلوع آفتاب سے پہلے بھی نکل سکتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عمر نے بھی آپ کی پیروی میں اسی وقت کا انتخاب کیا۔

مطیع سید: حضرت عمر کے ہاں بعض چیزوں میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعینہٖ پیروی کرنے کا رجحان نظر آتا ہے، چاہے وہ وجہ باقی نہ رہی ہو۔ جیسے طواف کے تین چکروں میں رمل کرنے کے متعلق بھی انھوں نے کہا کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو طاقت دے دی ہے، لیکن ہم اسے جاری رکھیں گے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم یہ کرتے آ رہے ہیں (رقم 317)۔ لیکن دوسرے کئی موقعوں پر حضرت عمر کا موقف اس سے مختلف دکھائی دیتا ہے، جیسے مولفۃ القلوب کے متعلق انھوں نے کہا کہ اب ان کو زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اب اسلام کو قوت حاصل ہو چکی ہے۔ تو ایسا کس بنیاد پر ہے کہ وہ بہت ساری چیزوں میں کہتے نظر آتے ہیں کہ ہم یہ عمل ویسے ہی کریں گے، جب کہ کئی چیزوں میں اس سے مختلف طریقہ اختیار کر لیتے ہیں؟

عمار ناصر: میرے خیال میں حضرت عمر کا رجحان یہ تھا کہ جن معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو ترک کرنے کا کوئی باعث نہیں، اس کو ویسے ہی قائم رکھا جائے، چاہے وہ عمل آپ نے کسی وقتی مناسبت سے کیا ہو۔ مثلاً طواف میں تین چکر تیز چلتے ہوئے لگانے کا عمل اگرچہ ایک خاص پس منظر میں کیا گیا تھا، لیکن اس کو ترک کرنے کا کوئی خاص داعیہ بھی موجود نہیں۔ اگرچہ وہ خاص وجہ موجود نہیں رہی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عمل کیا اور مسلمان کرتے چلے آ رہے ہیں تو اس کو چھوڑنے یا ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے مقابلے میں جہاں کوئی دینی مصلحت یا ضرورت تقاضا کر رہی ہو کہ اس طریقے کو ترک کر دیا جائے تو وہاں وہ اجتہاد کو ترجیح دیتے تھے۔ جیسے مولفۃ القلوب کی مد کو ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے موقوف کر دینا ایک دینی مصلحت تھی۔ اسی طرح قرآن مجید کو ایک مصحف میں یکجا کر دینے کے معاملے میں آپ دیکھیں تو حضرت ابو بکر متردد تھے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا تو ہم کیسے

کریں، لیکن حضرت عمر نے اصرار کیا کہ یہ ضروری کام ہے، اس کو کر لینا چاہیے۔

مطیع سید: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک سفر میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو موزوں پر مسح کرتے دیکھا تو تعجب ظاہر کیا اور مدینہ واپس آ کر حضرت عمر سے اس کی تصدیق چاہی۔ اس پر حضرت عمر نے کہا کہ جب سعد تمھیں کوئی حدیث بیان کریں تو اس کے متعلق کسی اور سے نہ پوچھا کرو (رقم 88)۔ اس میں ایک سوال تو یہ ہے کہ موزوں پر مسح کے متعلق تو ہم سنتے ہیں کہ اس کی حدیثیں متواتر ہیں۔ لیکن اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر جیسے صحابی بھی اس رخصت سے واقف نہیں تھے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟

عمار ناصر: حدیثوں کے متواتر ہونے کی بات تو بعد میں محدثین نے کہی ہے اور ان کے ہاں تواتر کا مفہوم مختلف ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ قرآن مجید متواتر ہے اور دین کے بنیادی فرائض، جیسے نماز اور حج وغیرہ متواتر ہیں تو یہاں تواتر کا معنی یہ ہوتا ہے کہ پوری امت ان چیزوں کو نقل کر رہی ہے اور ان سے واقف ہے۔ لیکن جب محدثین کسی بات کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی روایات متواتر ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ بات بہت سی روایات میں بیان ہوئی ہے اور جب ہم نے ان سب روایات کو جمع کر کے دیکھا تو یہ یقین پیدا ہو گیا کہ یہ بات درست ہے، اس کو نقل کرنے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ چنانچہ اس مفہوم میں محدثین موزوں پر مسح کی روایت کو اور اس طرح کے دوسرے واقعات کو متواتر کہتے ہیں۔ آپ اس کو دوسرے انداز میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ فقہا کے ہاں متواتر کا اطلاق اس پر ہوتا ہے، جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور سے ہی مسلمانوں کی پوری جماعت واقف ہو۔ اگر حضور کے یا صحابہ کے دور میں کوئی بات اس طرح معلوم و معروف نہ ہو تو وہ متواتر نہیں ہے، چاہے بعد کے دور میں وہ بہت مشہور ہو جائے۔ حنفی فقہا نے ایسی روایات کے لیے 'خبر مشہور' کی الگ اصطلاح وضع کی ہے، یعنی جو حضور کے زمانے سے تو متواتر نہ ہو، لیکن صحابہ یا تابعین کے دور میں جستجو اور تحقیق سے معروف ہو گئی ہو۔ محدثین کی اصطلاح اس سے مختلف ہے۔ اگر تیسری چوتھی صدی میں بھی کسی روایت کے بہت سے طرق جمع کرنے سے یہ اطمینان ہو جائے کہ واقعہ درست ہے تو محدثین اس کو بھی سند کے لحاظ سے متواتر کہہ دیتے ہیں۔

مطیع سید: دوسرا سوال یہ کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عمل کبھی کبھار کیا تھا، جس کی وجہ

سے کچھ صحابہ اس کو جانتے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے؟

عمار ناصر: زیادہ تر روایات میں یہی بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح سفر کی حالت میں کیا۔ حضر میں مسح کی روایتیں بہت کم ہیں۔ پھر سفر میں بھی، ظاہر ہے کہ سارے صحابہ ہر وقت حضور کے قریب نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے جن صحابہ کو سفر میں آپ کے قریب ہونے کی وجہ سے یہ عمل دیکھنے کا موقع ملا، وہ واقف تھے اور دوسرے صحابہ واقف نہیں تھے۔ حضرت عائشہ سے اسی لیے جب موزوں پر مسح کی مدت کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ حضرت علی سے پوچھو، کیونکہ وہ عام طور پر سفر میں حضور کے ساتھ ہوتے تھے (مسلم، رقم 276)۔ امام مالک سے بھی ایک موقف یہ منقول ہے کہ وہ حضر میں موزوں پر مسح کے قائل نہیں تھے۔ اس کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ اس کے ثبوت کی روایات سفر کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔

مطیع سید: غالباً امام ابو حنیفہ کے متعلق آتا ہے کہ انھوں نے اہل السنہ کی ایک پہچان یہ بتائی کہ وہ موزوں پر مسح کرتے ہیں۔ تو ایک ایسی بات کو جس سے سارے صحابہ بھی واقف نہیں تھے، وہ اسے اہل السنہ کی پہچان کیسے قرار دیتے ہیں؟

عمار ناصر: اس کا پس منظر مختلف ہے۔ دراصل مسلمانوں میں جو فرقہ بندی قائم ہو گئی تھی، اس میں مختلف گروہوں کی مذہبی شناخت میں خاص مسائل بن گئے تھے۔ مثلاً رافضی حضرت ابو بکر اور حضرت عمر سے براءت کرتے تھے۔ خوارج حضرت عثمان اور حضرت علی، دونوں سے براءت کرتے تھے اور حدیثوں میں قرآن سے زائد جو بہت سے احکام آئے ہیں، جیسے رجم اور موزوں پر مسح اور دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت، ان کا انکار کرتے تھے۔ اس پس منظر میں امام ابو حنیفہ نے کہا کہ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کو باقی صحابہ سے افضل ماننا، اور حضرت عثمان اور حضرت علی، دونوں سے محبت رکھنا اور موزوں پر مسح کرنا، یہ اہل السنہ کا موقف ہے۔

مطیع سید: ایک روایت آتی ہے کہ ایک شخص نے تلوار کے وار سے اپنے بیٹے کو قتل کر دیا تو حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہ فرمایا ہوتا کہ باپ سے قصاص نہیں لیا جا سکتا تو میں تمھیں قتل کر دیتا (رقم 98)۔ صحاح ستہ کے مطالعے میں آپ نے یہ فرق بتایا تھا کہ باپ ویسے ہی مار پیٹ کر رہا ہو اور اس دوران میں بچے کو ایسی سخت چوٹ لگ جائے جس سے

اس کی موت واقع ہو جائے تو اس میں قصاص نہیں ہو گا۔ لیکن اگر باپ ارادتاً بیٹے کو قتل کرتا ہے تو اس پر قصاص لیا جائے گا۔ یہاں تو بڑے صاف لفظ ہیں کہ باپ نے تلوار کے وار سے بیٹے کو قتل کر دیا اور حضرت عمر اس پر بھی یہی قانون جاری کر رہے ہیں کہ باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔

عمار ناصر: آپ کو یاد ہو تو ہم نے وہاں واضح کیا تھا کہ یہ فرق مالکیہ کا موقف ہے۔ مالکیہ یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا محل یہ ہے کہ ارادۂ قتل کے بغیر باپ کے ہاتھوں بیٹا قتل ہو گیا ہو تو قصاص نہیں ہو گا، لیکن اگر باپ دانستہ اور ارادتاً قتل کرے تو وہاں یہ حکم نہیں ہو گا، بلکہ قصاص لیا جائے گا۔ باقی فقہا کا یہ موقف نہیں ہے، وہ دونوں صورتوں میں قصاص نہ لینے کے قائل ہیں۔ اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات بیان فرمائی تو اس کا کیا موقع تھا، چونکہ یہ روایت میں بیان نہیں ہوا، اس لیے یہ دونوں تعبیرات کی محتمل ہے۔ حضرت عمر کے واقعے میں بھی پوری تفصیل بیان نہیں ہوئی کہ قتل کی نوعیت کیا تھی۔ بہ ظاہر الفاظ سے ایسے لگتا ہے کہ باپ نے کچھ فاصلے سے تلوار اٹھا کر بیٹے کی طرف پھینکی اور وہ کاری ضرب لگنے سے مر گیا۔ ضروری نہیں کہ اس کا قتل کرنے کا ہی ارادہ ہو، یہ قتل خطا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر یہ صورت ہے تو شاید حضرت عمر اس کو تہدید کے طور پر اور اس کی بے احتیاطی پر تنبیہ کرنے کے لیے فرما رہے ہیں کہ یہ حدیث نہ ہوتی تو میں تمھیں قتل کرا دیتا۔ لیکن اگر صورت ارادتاً قتل کرنے کی تھی تو پھر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت عمر کی تفہیم بھی جمہور فقہا کے مطابق ہے۔ لیکن مالکیہ اس صورت میں کہہ سکتے ہیں کہ ہم صحابی کے فہم اور تشریح سے اتفاق کرنے کے بجاے قیاساً حدیث کا محل طے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اجتہادی امور میں اختلاف کی بہت گنجایش ہوتی ہے۔

مطیع سید: حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے اپنی خالہ کو ایک غلام دیا ہے، مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے اسے باعثِ برکت بنائے گا اور میں نے انھیں اس بات سے منع کیا ہے کہ وہ اس کو حجام، قصاب یا سنار بنائیں (رقم 102)۔ اس سے منع کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، ان پیشوں میں کوئی حرج تو معلوم نہیں ہوتا؟

عمار ناصر: حجامت، یعنی پچھنے لگانے کے بارے میں تو احادیث میں ایک ظاہری سا تعارض ہے، جو محدثین کے ہاں زیر بحث آتا ہے۔ پچھنے لگانے کے پیشے کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند بھی

کیا، حجام بنانے سے بھی منع کیا، لیکن خود پچھنے لگوائے بھی ہیں اور حجامت کرنے والے کو اجرت بھی دی ہے۔ عام طور پر محدثین اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شرعی پہلو سے تو اس پیشے کی ممانعت یا حرمت نہیں ہے، لیکن چونکہ کام ایسا ہے کہ اس میں خون کو جسم سے کھینچنے کا کام منہ سے کرنا پڑتا تھا، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں طبعی کراہت محسوس کی۔ ایک نفیس آدمی کو گھن محسوس ہوتی ہے تو اس پہلو سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا، ورنہ پیشے کو آپ نے حرام نہیں کہا، اسی لیے خود لگوائے بھی اور اس کی اجرت بھی ادا کی۔

مطیع سید: اور دوسرے جو دو پیشے ہیں، ان سے کیوں منع فرمایا؟

عمار ناصر: ان میں بھی ایسا ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو عمومی حکم نہیں دے رہے کہ قصاب کا پیشہ حرام ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے اس غلام کے متعلق کہا ہے کہ اس کو قصاب نہ بنانا۔ قصاب کا کام ہر وقت گوشت کاٹنے کا ہوتا ہے تو شاید ایک طبعی ناپسندیدگی کا آپ کے ہاں اظہار ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ قصاب کے پیشے کے ساتھ اس ماحول میں کوئی ایسے پہلو جڑے ہوئے ہوں جو ناپسندیدہ ہوں۔ اسی طرح سنار کے متعلق بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ شارحین کہتے ہیں کہ سنار کو زیور بناتے ہوئے ملاوٹ بھی کرنی پڑتی ہے اور اس میں کمی بیشی یا دھوکے کا موقع بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اس پہلو سے آپ نے احتیاطاً اس سے منع کیا، ورنہ ان پیشوں کے فی نفسہٖ ناجائز ہونے کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔

مطیع سید: حضرت عمر کو شام میں طاعون کی اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ اگر میرا وقت آ گیا اور ابو عبیدہ بن جراح زندہ ہوئے تو میں ان کو اپنا خلیفہ مقرر کر دوں گا۔ یہ بات لوگوں کو پسند نہیں آئی اور انھوں نے کہا کہ قریش کے بڑے قبیلوں، یعنی بنو فہر کا کیا بنے گا؟ (رقم 108)۔ یہ بنو فہر کون تھے اور قریش میں ان کی کیا حیثیت تھی؟

عمار ناصر: فہر تو قریش ہی کا نام تھا، اور بنو فہر سے مراد پورا قبیلۂ قریش ہے۔ قریش کے اندر مختلف خاندان تھے اور ان میں سے کچھ خاندان، جیسے بنو ہاشم اور بنو امیہ افرادی تعداد اور سیاسی حیثیت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے۔ باقی خاندان، جیسے بنو عدی اور بنو جمح اور بنو تیم وغیرہ چھوٹے خاندان تھے۔ پہلے دو خلفا کا تعلق ان چھوٹے خاندانوں سے ہی تھا۔ حضرت ابو بکر، بنو تیم سے تھے اور حضرت عمر کا تعلق بنو عدی سے تھا۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کا تعلق بنو جمح

سے تھا۔ وہ چونکہ اکابر مہاجرین میں سے اور السابقون الاولون میں سے تھے، اس لیے حضرت عمر نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ اگر میں کسی کو خلیفہ نام زد کروں گا تو وہ ابوعبیدہ ہوں گے۔ ان کا نام حضرت ابو بکر نے بھی سقیفہ بنی ساعدہ میں پیش کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ ابوعبیدہ یا عمر میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لو۔ اب حضرت عمر نے جب تیسرے خلیفہ کے لیے بھی قریش کے ایک چھوٹے خاندان سے تعلق رکھنے والے صحابی کا نام لیا تو فطری طور پر لوگوں میں اور خاص طور پر قریش میں یہ سوال پیدا ہوا کہ بڑے خاندانوں، یعنی بنو ہاشم اور بنو امیہ کو خلافت سے دور کیوں رکھا جا رہا ہے؟

مطیع سید: اسی روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے معاذ بن جبل کے بارے میں بھی فرمایا کہ میں ان کو خلیفہ مقرر کرنا، پسند کروں گا (رقم 108)۔ اسی طرح ان کا ایک قول سالم مولیٰ ابی حذیفہ کے بارے میں بھی آتا ہے جو حضرت حذیفہ کے آزاد کردہ غلام تھے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو میں انھی کو اپنے بعد خلیفہ بنا دیتا (فضائل الصحابہ، ابن حنبل 2/742)۔ لیکن حضرت معاذ تو انصار میں سے تھے، قریش میں سے نہیں تھے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے موقف کے جواب میں تو یہی موقف پیش کیا گیا تھا کہ عرب کے لوگ قریش کے علاوہ کسی کی سیادت قبول نہیں کریں گے۔ تو پھر حضرت عمر ایک انصاری صحابی کا یا ایک آزاد کردہ غلام کا نام کیسے لے رہے تھے کہ ان کو خلیفہ بنا دیا جائے؟ کیا قریش یا عرب کے لوگ ان کی سیادت قبول کر لیتے؟

عمار ناصر: یہ اصل میں کسی آدمی کی اہلیت کو بیان کرنے کا ایک انداز ہوتا ہے کہ اگر اس کا موقع آتا اور کوئی مانع نہ ہوتا تو میں ان لوگوں کو خلیفہ نام زد کرتا، کیونکہ وہ اس کے اہل ہیں کہ خلافت کی ذمہ داری انجام دیں۔ اشخاص کی تعریف کی جاتی ہے تو اس کے مختلف محل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ حضرت عمر ان کو باقاعدہ خلیفہ نام زد کرنے کے امکان کی یا گنجایش کی بات کر رہے ہوں۔ عام طور پر شارحین نے حضرت عمر کے ان اقوال کا یہی محل بیان کیا ہے۔ لیکن مجھے خیال ہوتا ہے کہ حضرت عمر خلافت اور قریش کے باہمی تعلق کو اس طرح نہیں دیکھتے تھے کہ یہ لازم و ملزوم ہے یا ہمیشہ ایسے ہی رہنا چاہیے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں بھی قریش میں سے خلیفہ ہونے کا نکتہ سیاسی مصلحت کے پہلو سے بیان کیا گیا تھا، اور جہاں تک مجھے یاد ہے، حضرت ابو بکر نے اور بعض انصاری صحابہ نے بیان کیا تھا۔ حضرت عمر نے وہاں بھی یہ استدلال نہیں کیا۔ ان کا استدلال

دراصل حضرت ابو بکر کی شخصیت کے حوالے سے تھا کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کا خلیفہ بننا اللہ اور اس کے رسول کی نظر میں قابل قبول نہیں ہو گا۔ لیکن وہ مرحلہ گزر جانے کے بعد اور حکومت میں استحکام واستقرار پیدا ہو جانے کے بعد حضرت عمر جب مستقبل کے امکانات پر غور کر رہے ہوں گے تو میرے خیال میں ان کا رجحان یہ بنا ہو گا کہ خلافت کے منصب کا تعلق سیاسی عصبیت کے بجاے افراد کی اہلیت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یعنی قابل اور اہل افراد اگر قریش کے علاوہ انصار میں یا دوسرے قبائل میں بھی ہوں تو ان کو یہ ذمہ داری ملنی چاہیے۔ اس کو آپ ایک طرح سے ان کی 'loud thinking' کہہ سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ عملی حالات میں اس ارادے پر عمل کرنا چاہتے ہوں یا کر سکتے ہوں، لیکن وہ اس پہلو سے متعلق سوچ ضرور رہے تھے۔

مطیع سید: حضرت عمر نے لوگوں کو خطبہ دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو جو رخصت دینی تھی، وہ دی۔ لیکن اللہ کے نبی اب دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں، اس لیے تم حج اور عمرہ بھی مکمل کرو، جیسے اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنی عورتوں کی شرم گاہوں کو بھی محفوظ رکھو (رقم 104)۔ یہ حضرت عمر کیا بات کہہ رہے ہیں اور کس رخصت کی بات کر رہے ہیں؟

عمار ناصر: یہاں وہ حج تمتع اور عورتوں کے ساتھ وقتی نکاح، یعنی متعہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کسی خاص مصلحت کے تحت یہ رخصت دی تھی کہ لوگ محدود مدت کے لیے عورتوں سے نکاح کر لیں اور حج کے سفر میں ساتھ ہی عمرہ بھی کر لیں، لیکن یہ شریعت کا اصل یا مستقل حکم نہیں ہے۔ اصل حکم یہ ہے کہ عمرے کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کیا جائے؛ ایک سفر میں دونوں کو جمع نہ کیا جائے۔ اسی طرح عورتوں سے نکاح کیا جائے تو وہ مستقل رشتے کی نیت سے ہو، وقتی اور عارضی نکاح نہ کیا جائے۔ ایک اور بڑی مشہور روایت ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ دو متعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہوتے تھے، لیکن میں ان سے منع کرتا ہوں۔ ایک حج تمتع اور دوسرا متعۃ النساء (مستخرج ابی عوانہ، رقم 3349)۔

مطیع سید: اس سے تو پتا چلتا ہے کہ حضرت عمر متعۃ النساء کی طرح حج تمتع کو بھی وقتی نوعیت کا حکم سمجھتے تھے، لیکن آگے ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ حج تمتع بھی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ لوگ پیلو کے درخت کے نیچے بیویوں کے ساتھ ہم

بستری کریں اور صبح اٹھ کر حج کی نیت کر لیں (رقم 342)۔ یعنی ان کو ذاتی طور پر یہ پسند نہیں تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ یہ فائدہ اٹھائیں۔ یہ ان کا ذاتی ذوق تو ہو سکتا ہے، لیکن اس کی بنیاد پر وہ لوگوں کو کیوں منع فرما رہے ہیں؟ یہ موقف کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

عمار ناصر: اصل میں روایات میں حضرت عمر سے مختلف طرح کے استدلال منقول ہیں۔ بعض میں یہ ہے کہ انھیں حج کے سفر میں حرم کے اندر حاجیوں کا میاں بیوی کا تعلق قائم کرنا پسند نہیں تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ حج کے لیے لوگ حرم پہنچیں تو پھر حج مکمل کرنے سے پہلے ہم بستری وغیرہ سے دور رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جب حج کا احرام باندھنے والے صحابہ کو یہ حکم دیا کہ وہ عمرہ کر کے احرام کھول لیں تو اس وقت بھی صحابہ اسی وجہ سے متردد رہے اور کہا کہ اگر ہم احرام کھول لیں تو پھر حج کے دن آنے پر اس حالت میں منیٰ کی طرف جائیں کہ ہم نے تازہ تازہ بیویوں سے ہم بستری کی ہو؟ (مسلم، رقم 1216)۔ بعض دوسری روایات میں ہے کہ حضرت عمر نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ کثرت سے بیت اللہ کی زیارت کو آتے رہیں (السنن الکبریٰ، بیہقی، رقم 8877)۔ شاید ان کو یہ خدشہ تھا کہ اگر لوگوں نے حج کے ساتھ ہی عمرہ کرنا شروع کر دیا تو پھر وہ حج کے علاوہ بیت اللہ نہیں آئیں گے اور یہاں سال کے باقی مہینوں میں لوگوں کی آمد و رفت کم ہو جائے گی۔ اور بعض روایات میں یہ ہے کہ وہ اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں دی گئی ایک وقتی رخصت سمجھتے تھے، جیسا کہ اس روایت میں بیان ہوا ہے، جو آپ نے ذکر کی ہے۔

اب ہو سکتا ہے کہ ان کا اصل موقف یہی ہو کہ حج تمتع ایک وقتی رخصت تھی، ورنہ حج اور عمرے کا الگ الگ سفر کرنا ہی شریعت میں مطلوب ہے۔ لیکن اس پر بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ رخصت تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں تصریحاً بیان کی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ جانور کی قربانی کرنے یا روزے رکھنے کا حکم بھی دیا ہے (البقرہ 2:196)۔ یعنی اس رخصت کو وقتی اور عارضی کہنا بہت مشکل ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان کا اصل اشکال یہ تھا کہ حرم کے حدود میں لوگ عمرے کا احرام کھولنے کے بعد درختوں کے نیچے اور جہاں بھی جگہ ملے، بیویوں سے ہم بستر ہو رہے ہوں تو یہ کوئی اچھا منظر نہیں ہے۔ اس زمانے میں، ظاہر ہے کہ سارے حاجیوں کو چار دیواری میسر نہیں تھی اور اکثر کو کھلی جگہوں پر ٹھہرنا پڑتا تھا تو ایسے حالات میں ہم بستری کے لیے ضروری پردہ

داری کا اہتمام ممکن نہیں تھا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے حضرت عمر نے لوگوں کو منع کرنا چاہا اور پھر غالباً تائید کے طور پر یا ضمناً یہ استدلال کیا ہو گا کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں دی گئی ایک وقتی رخصت تھی، ورنہ اللہ تعالیٰ کا اصل مطالبہ یہ ہے کہ لوگ الگ الگ سفر کر کے عمرہ اور حج ادا کریں۔ 'وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ' کو وہ اسی معنی پر محمول کر رہے ہیں۔

مطیع سید: لیکن حضرت علی اور دیگر صحابہ تو حضرت عمر کے اس موقف پر تنقید کرتے تھے؟

عمار ناصر: جی، حضرت عمر پر بڑے سخت الفاظ میں تنقیدیں ہوئیں کہ وہ کون ہوتے ہیں اس سے روکنے والے، جب کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے۔

مطیع سید: متعۃ النساء کے متعلق بھی اہل تشیع کا یہ کہنا ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے منع نہیں فرمایا، بلکہ حضرت عمر نے منع فرمایا۔ کیا اہل السنہ بھی یہی مانتے ہیں کہ حضرت عمر نے منع فرمایا تھا یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود منع فرما دیا تھا؟

عمار ناصر: اگر آپ اہل تشیع کی نظر سے دیکھیں تو وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر ایک جسارت مند آدمی تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں کے آگے بھی اپنی مرضی چلاتے تھے۔ وہ یہی ساری مثالیں بیان کرتے ہیں۔ حسین موسوی عراق کے ایک بڑے شیعہ عالم ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ''النص و الاجتہاد'' میں خلفا کی ایسی ساری مثالیں جمع کی ہیں کہ ایک طرف نص تھی، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تھا اور خلفا نے اس کے مقابلے میں اپنی رائے قائم کی۔ البتہ متعۃ النساء کے متعلق اہل تشیع کا اعتراض اس لیے نہیں بنتا کہ حضرت علی کا موقف بھی اس کے متعلق یہی تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض خاص مواقع پر اس کی اجازت دی تھی، لیکن پھر اس سے منع فرما دیا تھا (بخاری، رقم 6560)۔ البتہ حج تمتع کے متعلق حضرت علی نے حضرت عمر سے اتفاق نہیں کیا اور ان پر تنقید کی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی اجازت پر کیوں پابندی لگا رہے ہیں۔ اہل سنت کی عمومی رائے بھی یہی ہے کہ اس کی ممانعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دی تھی۔ اصل ماخذ وہ ہے، لیکن بعض صحابہ اس کو جائز سمجھتے ہوئے یا نسخ کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ایسا کر رہے تھے تو جب حضرت عمر کے علم میں آیا تو انھوں نے اس کو سختی سے روک دیا۔

مطیع سید: لیکن روایات سے تو یہ نہیں لگتا کہ حضرت عمر یہ کہہ رہے ہیں کہ اس سے نبی صلی

اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا تھا۔

عمار ناصر: جی، ایسا ہی ہے۔ ان کا استدلال نقلی نہیں تھا، ان کا استدلال مقاصدِ شریعت کے لحاظ سے تھا۔

مطیع سید: کیا حضرت عمر کے بعد کسی اور نے اس کو جائز قرار دیا؟

عمار ناصر: حضرت عمر کے فیصلے کے بعد بھی اختلاف ختم تو نہیں ہوا۔ دو ڈھائی صدیوں تک اختلاف موجود رہا اور اہل السنہ میں بھی دونوں آرا کے حامل گروہ موجود رہے۔ امام شافعی نے بھی اسے ایک اختلافی مسئلے کے طور پر ذکر کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس چونکہ حلت کے قائل تھے تو اہل مکہ کے ہاں بہت عرصے تک یہی موقف رائج رہا۔ پھر آہستہ آہستہ فقہی مسالک کے دور تک آتے آتے اہل السنہ کے ہاں تو اس کی حرمت پر عمومی اتفاق ہو گیا، لیکن جو حلت والا موقف تھا، اس کو امامیہ نے اختیار کر لیا۔

مطیع سید: اہلِ سنت کے ہاں اس پر اتفاق ہو جانے کے اسباب کیا تھے؟

عمار ناصر: میرے خیال میں بڑا سبب تو وہی مقاصد شریعت والا استدلال تھا جو حضرت عمر نے بیان فرمایا۔ یہ تو واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہر حال ایک اضطراری کیفیت میں ہی اس کی رخصت دی تھی، عام اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن ایسی چیزوں میں رخصت کو عمومی اجازت بننے میں دیر نہیں لگتی، یعنی سوء استعمال کے امکانات بہت غالب ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت عبد اللہ بن عباس کو، جو لوگوں کو باقاعدہ اس کے جواز کا فتویٰ دیا کرتے تھے، جب پتا چلا کہ لوگ اس رخصت کو استعمال کیسے کر رہے ہیں تو انھوں نے رائے سے رجوع تو نہیں کیا، لیکن لوگوں کو فتویٰ دینا چھوڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں لوگوں کو یہ تو نہیں کہہ رہا کہ اس کا عام استعمال کریں، میں تو اس کو اسی طرح سمجھتا ہوں جس طرح اضطرار کی حالت میں مردار کھانا حلال ہوتا ہے۔ تو مجھے ایسے لگتا ہے کہ سنی اہلِ علم نے بھی بنیادی طور پر یہ دیکھا کہ اس رخصت کو اگر باقی رکھا گیا تو اس کا غلط استعمال بہت زیادہ ہو گا۔ حضرت عمر نے بھی بنیادی طور پر اسی کو ملحوظ رکھا، اسی لیے وہ کوئی نقلی دلیل نہیں دے رہے کہ یہ منسوخ ہو گیا ہے۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ طریقہ اگر رائج ہو گیا تو اس کے مفاسد کو روکنا بڑا مشکل ہو گا۔

مطیع سید: اہلِ تشیع کی روایت میں اس کی حلت بھی موجود ہے اور ان کے ہاں عملاً یہ چل بھی

رہا ہے۔ ان کی معاشرت میں اس سے کیا مفاسد رونما ہوئے ہیں؟

عمار ناصر: اہل تشیع بھی اس کو نظری طور پر جائز سمجھتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ خاص شرائط بھی لگاتے ہیں اور حالات کے لحاظ سے عملاً اس سے فائدہ اٹھانے کو روک بھی دیتے ہیں۔ ان کے فقہا جب دیکھتے ہیں کہ اس کا استعمال ٹھیک نہیں ہو رہا تو پھر اجازت نہیں دیتے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایران میں امام خمینی سے پہلے یہ قانونی طور پر جائز تھا، لیکن امام خمینی نے آ کر اس کو روک دیا۔ تو ان کے سامنے اس کے عملی پہلو بھی ہوتے ہیں، لیکن جب وہ اصولی اور نظری بحث کرتے ہیں تو یہی موقف ہوتا ہے کہ یہ منسوخ نہیں ہے۔

[باقی]

گفتگو: محمد حسن الیاس

اخذ و تدوین: شاہد رضا

رمضان اور تعلق باللہ

رمضان المبارک وہ بابرکت مہینا ہے جو ہر سال ہماری زندگیوں میں روحانی بہار بن کر آتا ہے۔ اس مہینے کی رونقیں، عبادات کا اہتمام، مساجد کی آبادیاں اور دلوں میں پیدا ہونے والا ایک خاص جذبہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ رمضان محض دنوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک عظیم موقع ہے؛ اپنے رب کے ساتھ تعلق کو از سرِ نو سمجھنے، مضبوط کرنے اور اپنی زندگی میں مثبت تبدیلیاں پیدا کرنے کا موقع۔

بہ طور انسان جب ہم شعور کی آنکھ کھولتے ہیں تو سب سے پہلے اپنے وجود اور اپنے گرد و پیش کی کائنات پر غور کرتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو کسی خارجی تعصب کے بغیر اپنی فطرتِ سلیمہ کی روشنی میں اس وجودی حقیقت پر غور کرتا ہے تو اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ میں ایک مخلوق ہوں، اور میرا وجود اور گرد و پیش کی کائنات اس کی شہادت دیتی ہے۔ اس غور و فکر کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہم خود بھی مخلوق ہیں اور یہ پوری کائنات بھی کسی خالق کی تخلیق ہے۔ یہ حقیقت عقل اور علم، دونوں کی روشنی میں واضح ہو جاتی ہے کہ ہم بنائے گئے ہیں، خود بخود وجود میں نہیں آئے۔ یہاں سے ایک ناگزیر سوال جنم لیتا ہے کہ اگر ہم مخلوق ہیں تو ہمارا خالق کون ہے؟

خالق کی تلاش کے اس سفر میں انسان سرگرداں ہو جاتا ہے۔ وہ جب اپنے ارد گرد نظر دوڑاتا ہے تو اُس کو مختلف جوابات ملتے ہیں؛ کچھ لوگ اس کائنات کو ہی اس تخلیق کا خالق قرار دے رہے ہوتے ہیں، کچھ لوگ اس جستجو میں سرگرداں ہونے کے بعد اپنی روحانی سفر کی معراج کی تسکین

کو اس سوال کا جواب قرار دیتے ہیں اور کچھ لوگ ایک الوہی دعوت کے نتیجے میں وجود پذیر ہونے والی روایت کے علم بردار بن کر ہمیں خدا کے وجود کا تعارف کراتے ہیں۔ یعنی کوئی کائنات کو ہی خالق مان لیتا ہے، کوئی اپنے باطنی تجربات اور روحانی کیفیات کو جواب سمجھ لیتا ہے اور کچھ لوگ ایک ایسی روایت سے روشناس ہوتے ہیں جو خدا کا واضح، مربوط اور معقول تعارف پیش کرتی ہے۔ یہ تیسرا ذریعہ دراصل انبیا علیہم السلام کا ذریعہ ہے۔ یہ وہ برگزیدہ لوگ ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیں خدا نے منتخب کیا ہے، ہم خالق کائنات کی طرف سے انسانوں کے لیے ہدایت لے کر آئے ہیں، ہم اس کی بات تم تک پہنچانا چاہتے ہیں اور جو تمھاری فطرت کے سوالات ہیں، جو وجودی حقائق کے پلازیبل (plausible) نتائج ہیں، اُن کی پوری خبر ہم خالق سے لے کر تمھیں دے دیتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی یہی خبر ہے جو ہمیں خدا کا حقیقی تعارف کراتی ہے۔ جب ہم اس خبر کو ایمان اور یقین کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں ہمارے وجود کی بنا پر خالق اور مخلوق کے درمیان کچھ لازمی تعلقات، رشتے اور تقاضے پیدا ہوتے ہیں۔ غور کیا جائے تو خالق کے ساتھ ایک باشعور بندے کے، مخلوق ہونے کی حیثیت سے، جو تعلقات اور تقاضے پیدا ہوتے ہیں، وہ تین ہی نوعیت کے ہیں:

ایک پرستش،

دوسرے اطاعت،

اور تیسرے نذر (قربانی)۔

پہلا تعلق پرستش کا ہے۔ جب ہم کسی کو اپنا خالق مان لیتے ہیں تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اسی کی عبادت کریں، اسی کے سامنے جھکیں اور اپنی بندگی کا اظہار اسی کے لیے کریں۔ اسی کو یہ باور کرایا جائے گا کہ ہم روے زمین پر اس کے علاوہ کسی دوسری ہستی کے ساتھ اپنے اس نوعیت کے تعلق کو قائم نہیں کرتے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے عبادات کا پورا کا پورا تصور پیدا ہوتا ہے۔ نماز اسی پرستش کی علامت ہے۔ ایک بندۂ مومن، ایک عبد اپنے معبود کے ساتھ، ایک غلام اپنے آقا کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کرتا ہے۔ قیام، رکوع اور سجدہ دراصل اس بات کا علامتی اظہار ہے کہ زمین پر اللہ کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جو عبادت کی مستحق ہو۔ اس کا کوئی ہم سر نہیں، اس کا

کوئی ساجھی نہیں، دنیا میں اس کا ایسا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے جو خلق میں یا تدبیر امور میں اس کا معاون ہو، وہ اکیلا ہے، وہ یگانہ ہے، وہ بے ہمتا ہے، وہ یکتا ہے۔ چنانچہ یہ پہلا تعلق ہے، جو ایک بندۂ مومن کا اپنے خالق کے ساتھ، ایک عبد کا اپنے معبود کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اپنے خالق کی پرستش کی جائے گی۔

دوسرا تعلق اطاعت کا ہے۔ اگر وہ خالق ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ حی و قیوم خالق ہے۔ اس کا کچھ منشا ہو گا، کچھ خواہشات ہوں گی، کچھ احکام و ہدایات ہوں گے، اس کے حدود و قیود ہوں گے جن کے مطابق وہ اپنے بندوں کو چلانا چاہتا ہے۔ خالق کائنات یہ کہتا ہے کہ میں نے تمھیں دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا ہے؛ امتحان کا نتیجہ اور جزا و سزا بھی مرتب ہو گی۔ اب اس جزا و سزا میں کامیابی کے لیے اس کی شریعت کے مجھ سے متعلق کچھ تقاضے ہیں؛ وہ تقاضے اس کے اوامر اور نواہی ہیں۔ اب اگر میں عبد ہوں تو اپنے معبود پر ایمان کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ میں اس کی اطاعت کروں۔ یعنی اس کے احکام کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں، اس کی اتھارٹی اور فیصلہ کن حیثیت کو اپنی زندگی میں مانوں۔ میری فطرت میں جو روشنی موجود تھی، جو فجور و تقویٰ کی رمک موجود تھی، اس کی تفصیلات کو اگر اس نے پیغمبر اور قرآن و سنت کے ذریعے سے شریعت میں ڈھال دیا ہے تو اب اس کی اطاعت مجھ پر لازم ہے۔ اس کی طرف سے دیے گئے احکام، ہدایات اور حدود ہی ہمارے لیے معیار ہیں۔ چنانچہ ایک بندۂ مومن کے لیے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے۔

تیسرا تعلق نذر اور قربانی کا ہے۔ اپنے وجود سے کسی چیز کی نذر اور قربانی کی جائے گی تو وہ خالص اسی ذاتِ واحد کے لیے ہو سکتی ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں ہو سکتی۔ کسی چیز کو صرف خدا کی نذر کیا جائے گا تو اس سے قربانی وجود پذیر ہوتی ہے؛ جو اطاعت کا جذبہ ہے، اس سے روزہ وجود پذیر ہوتا ہے اور اسی طریقے سے جو پرستش کا جذبہ ہے، اس سے نماز وجود پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ انسان جب اپنی کسی چیز کو خالص اللہ کے لیے پیش کرتا ہے تو یہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان، مال اور خواہشات تک کو اللہ کی رضا پر قربان کرنے کے لیے تیار ہے۔ قربانی اسی جذبے کی علامت ہے، روزہ اسی اطاعت کا مظہر ہے اور نماز اسی پرستش کا عملی اظہار ہے۔

چنانچہ بندۂ مومن کی حیثیت سے یہ وہ جہات ہیں جن سے ہم خالق کے ساتھ متعلق ہوتے

ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بتاتا ہے کہ ان تمام عبادات کا اصل مقصد تزکیہ ہے، یعنی انسان کا پاکیزہ ہونا۔ اس پاکیزگی کی تین جہات ہیں:

1۔ علم و عمل کی پاکیزگی۔

2۔ خورونوش کی پاکیزگی۔

3۔ بدن کی پاکیزگی۔

عبادات ہمیں اسی پاکیزگی پر قائم رہنے اور اس کے بڑھانے کی مہمیز بنتی ہیں۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ نماز انسان کو فواحش اور منکرات سے روک دیتی ہے،[1] روزہ حدود آشنا بننے لیے فرض کیا گیا ہے،[2] اور قربانی کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تک نہ گوشت پہنچتا ہے نہ خون، بلکہ تقویٰ اور وہ جذبہ پہنچتا ہے جو تمھارے دل کے اندر پنہاں ہے کہ اللہ کے اذن پر اگر جان قربان کرنے کا بھی موقع آتا ہے تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے؛[3] یہ ہم علامتی طور پر ایک جانور کی جان خدا کی نذر میں پیش کر رہے ہیں۔ چنانچہ یہ جو ساری عبادات کا نظام ہے، اس کا مقصد ہمارے علم و عمل، اخلاق، رویوں، معاملات، خورونوش اور بدن کی پاکیزگی اور تزکیہ ہے۔

مذہب ہم سے یہ پاکیزگی اس لیے چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان بندوں کے امتحان کے نتیجے میں جو جزا و سزا کا ایک منصوبہ مرتب کیا ہے، اس میں وہ پاکیزہ لوگوں کو اپنی جنت کا ابدی

---

[1]۔ العنکبوت 45:29۔ 'اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ' (کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے)۔

[2]۔ البقرہ 183:2۔ 'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ' (ایمان والو، تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے، جس طرح تم سے پہلوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم اللہ سے ڈرنے والے بن جاؤ)۔

[3]۔ الحج 37:22۔ 'لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَ لَا دِمَآؤُھَا وَ لٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ' (اللہ کو نہ اِن کا گوشت پہنچتا ہے نہ اِن کا خون، بلکہ اُس کو صرف تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اِسی طرح اللہ نے اُن کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اللہ نے جو ہدایت تمھیں بخشی ہے، اُس پر تم اللہ کی بڑائی بیان کرو)۔

شہری بنانا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے ایک عظیم انعام تیار کر رکھا ہے؛ ہمیشہ کی جنت، دائمی زندگی اور اس میں خوف اور غم سے پاک وجود۔ اللہ تعالیٰ بندۂ مومن کو انعام کے طور پر اپنی بادشاہی میں شریک کرنا چاہتا ہے؛ اب خدا ہر عیب سے منزہ اور ستودہ صفات ہے، اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ان بندوں کو اس میں شامل کر لے کہ جن کے دلوں میں پاکیزگی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ چنانچہ مذہب اور عبادات یہ چاہتے ہیں کہ ہم پاکیزہ بنیں۔ اگر ہم ان سب پر عمل پیرا ہیں اور وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو رہا جو مطلوب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادات محض رسوم اور آداب بن کر رہ گئی ہیں، اور ایسی عبادات کا اللہ کی بارگاہ میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ان عبادات کا اثر ہماری زندگی میں ظاہر نہ ہو تو ایسی عبادات اللہ کے ہاں بے وزن ہو جاتی ہیں۔

مذہبی اور الہامی روایت کی ماضی کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب مذہبی ذہن دین کی اس اصل اورینٹیشن (orientation) — آخرت — کو تبدیل کر کے دنیا کے ٹینجیبل (tangible) مقاصد، یعنی نظام مصطفیٰ کے قیام، غلبۂ اسلام کی جدوجہد یا خلافت اسلامیہ کے احیا پر متوجہ کر دیتا ہے تو یہ پورا کا پورا عبادات کا نظام فکر اپنی اصل سے ہٹ کر بے روح ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر عبادت میں دل نہیں لگتا۔ عصر حاضر میں اس پس منظر میں وجود پذیر ہونے والی پوری تحریک کے بانی کا جو نظریہ تھا، اس کو شاعر نے شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

یعنی نمازی تو مجھے ہونا تھا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کر کے پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے، لیکن اس عبادت کی جو اورینٹیشن تھی، وہ بالکل تبدیل ہو کر رہ گئی، یعنی میں دین کی سرفرازی میں نمازی کیوں ہوں، اس لیے کہ دین کی سرفرازی اصل مقصود ہے، نماز کا کوئی فائدہ نہیں۔ چنانچہ عبادت کا مقصود ختم ہو گیا۔ جب عبادت کا مقصود ختم ہو گیا تو ہمارے معاشرے میں لاکھوں لوگوں کے حج کرنے، قربانیاں دینے، نمازیں پڑھنے اور رمضان میں نماز تراویح پڑھنے — جب کہ رمضان میں تو پورا کا پورا عالم اسلام ایک طرح سے خدا کی بندگی کا مظہر بن جاتا ہے — کے باوجود معاشرے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ علم و اخلاق میں پستی ابتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادت کا جو مقصود تھا، عبادت کی جو حقیقت تھی، عبادت جس منزل تک

ہمیں لے جانا چاہتی تھی، اس منزل کو ہم نے تبدیل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عبادات کثرت سے ادا تو ہوتی ہیں، مگر معاشرہ اخلاقی زوال کا شکار رہتا ہے۔

ان عبادات پر ہم اس شعور کے ساتھ عمل پیرا ہوں کہ ہمارا مقصود کیا ہے تو پھر عبادات کے درمیان میں جو وقفہ ہے، اس میں اس کا ظہور ہونا شروع ہو جائے گا۔ نماز ہم نے اس لیے پڑھنی ہے کہ یہ خدا کی یاد دہانی کراتی ہے۔ قرآن مجید نے 'اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ'، "میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام رکھو"[4] کہا ہے تو اس یاد دہانی کا مطلب یہ ہے کہ میں جب نماز پڑھ کر نکلوں گا اور میری گاڑی غلط پارک ہوئی ہو گی تو میرے اندر یہ شرمندگی ہونی چاہیے یا میں نے چپلیں غلط جگہ پر اتاری ہیں تو میرے اندر یہ شرمندگی ہونی چاہیے کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی یاد دہانی کو فراموش کر دیا ہے یا میں نے مسجد کا غسل خانہ استعمال کر کے صاف نہیں کیا تو میرے اندر یہ یاد دہانی ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا جو مقصود تھا، اس کو میں حاصل نہیں کر رہا۔ پھر میں دکان پر جاتا ہوں اور اگر سچ نہیں بولتا، کم تولتا ہوں؛ اگر غیبت کرتا ہوں، عیب جوئی کرتا ہوں؛ اگر میرے دل میں مسلمانوں کے بارے میں حسد، کینہ اور بغض کے جذبات ہیں؛ میں اگر اپنی بیوی سے سختی سے، تلخی سے بات کرتا ہوں، نوکیلے جملے کہتا ہوں اور میرے اوپر اگر تنقید ہو تو میں منہ پھاڑ کر لوگوں کے عیوب کو دنیا تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کا جو مقصود تھا، وہ مجھے حاصل نہیں ہوا۔

چنانچہ رمضان المبارک میں مسلمانوں میں ایک جذبہ ہوتا ہے، خدا کی مدد بھی ہمارے ساتھ شامل حال ہوتی ہے، شیطان کو بھی بند کر دیا جاتا ہے۔[5] یہ موقع ہے کہ ہم سب اس پر غور کریں کہ عبادت کا جو مقصود ہے، کیا وہ حاصل ہو رہا ہے؟ اگر وہ حاصل نہیں ہو رہا تو یہ جو کچھ ہم کر

---

[4] ۔طٰہٰ 14:20۔

[5] ۔ بخاری، رقم 3277۔ 'قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ: "إِذَا دَخَلَ رَمَضَانُ فُتِّحَتۡ أَبۡوَابُ الۡجَنَّۃِ وَغُلِّقَتۡ أَبۡوَابُ جَهَنَّمَ وَسُلۡسِلَتِ الشَّیَاطِینُ" (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب رمضان کا مہینا آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں اور شیاطین کو زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے)۔

رہے ہیں، یہ محض رسمیات ہیں، ایکشنز ہیں۔ ان کی حقیقت خدا تک نہیں پہنچتی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت میں ارشاد فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ”مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالْعَمَلَ بِهِ وَالْجَهْلَ، فَلَيْسَ لِلَّهِ حَاجَةٌ أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ“. (بخاری، رقم 6057)

”ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص (روزہ کی حالت میں) جھوٹی بات کرنا اور اس پر عمل کرنا اور جہالت کی باتوں کو نہ چھوڑے تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑے۔“

یعنی اگر روزہ رکھ کر بھی تم لغو گوئی کرتے ہو تو تمھارے بھوکے پیاسے رہنے سے اللہ کو کچھ فائدہ نہیں ہے۔ ہمیں جس چیز پر بہت غور و فکر کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ دین کی اورینٹیشن آخرت ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک مقصد تک پہنچانا چاہتا ہے؛ اس مقصد کے حصول میں سرگرداں رہ کر عبادت ہوگی تو شعوری عبادت بنے گی۔ اس میں دل بھی لگے گا اور اس کا مقصد بھی حاصل ہوگا۔

رمضان ہمیں یاد دلاتا ہے کہ دین کی اصل اورینٹیشن آخرت ہے اور عبادات کا اصل مقصد تزکیۂ نفس ہے۔ اگر ہم اس شعور کے ساتھ عبادت کریں تو نہ صرف عبادت میں لذت پیدا ہوگی، بلکہ ہماری زندگی، ہمارے اخلاق اور ہمارا معاشرہ بھی بدلنا شروع ہو جائے گا۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(29)

[صاحب ''تدبر قرآن'' کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ابو صالح اصلاحی کی وفات کا حادثہ مولانا اصلاحی کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ لیکن اس صدمے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ مولانا نے اسے جس انداز اور جس صبر سے برداشت کیا، وہ ان کی سیرت کا بے مثال نمونہ ہے۔ اس سے ''تزکیۂ نفس'' کے مصنف کا اپنے پروردگار سے گہرا تعلق ممثل ہو کر سامنے آتا ہے، ''تدبر قرآن'' جیسی تفسیر کے مُفسّر کا اپنے رب پر جو توکل اور بھروسا سامنے آتا ہے، وہ انھیں اپنی تفسیر ہی کی طرح علماے حق میں ممتاز و ممیز کر دیتا ہے۔ اس واقعے کو سامنے رکھ کر انھوں نے اپنا جو محاسبہ کیا، وہ آخرت پر ایمان کی پر شکوہ مثال ہے۔ تصوف کو 'متوازی دین' قرار دینے والے اس ناقد بے مثل کا اپنے اللہ سے راز و نیاز کا کیا انداز تھا۔

عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے ان سے برسوں کے تعلقات اور سینکڑوں ملاقاتوں میں کبھی یہ واقعہ زیر بحث نہ آیا۔ چنانچہ تعلق خاطر کے بہت سے برسوں میں مجھے ان کی زندگی کو اس درجہ

متاثر کرنے والے اس واقعے کا کوئی علم نہ ہوا۔ مجھے جب اس کے بارے میں معلوم ہوا تو اس وقت مولانا سے براہ راست بات کرنا ان کے ضعف، بیماری اور ثقل سماعت کے باعث خاصا مشکل ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے ان کے 'تلمیذ خاص' مرحوم خالد مسعود سے ایک دفعہ بہ طور خاص تذکرہ کیا تو انھوں نے بتایا کہ مولانا کو اپنے ان فرزند سے بہت زیادہ توقعات تھیں۔ حادثے پر ہم، یعنی حلقۂ تدبر قرآن سے متعلق شاگرد اس خدشے میں مبتلا ہوئے کہ مولانا محترم اس سانحۂ عظیم کو کیسے برداشت کریں گے، لیکن وہ بتاتے ہیں کہ مولانا کو ہم نے اس موقع پر صبر و استقامت کا پہاڑ پایا۔ انھوں نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ بس بہت زیادہ خاموش ہو گئے اور اس کے بعد وہ ان کے تذکرے پر بھی خاموش ہو جاتے۔ بہت کم لوگوں نے انھیں چشم نم کے ساتھ دیکھا۔ جناب خالد مسعود بتاتے کہ ہمیں احساس ہوا کہ وہ اب اس حادثے کو بھلانے کے لیے ابو صالح کے تذکرے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی اسے ایک خاموش پیغام سمجھا اور ان کی موجودگی میں اس واقعے کا تذکرہ کرنے سے احتراز کرتے کہ کہیں ان کے زخم تازہ نہ ہو جائیں۔

یہاں ہم ان دو مضامین کے کچھ اقتباس نقل کرتے ہیں، جن سے یہ راز کھلتا ہے کہ مولانا نے اپنے ان صاحب زادے کے غم کو کیسے سہا اور ابو صالح ان کے لیے کیا تھے اور ان کی سیرت و کردار کے کیا گوشے تھے جو ان کے لیے باعثِ شکر اور سامانِ اطمینان تھے۔ ان سے ان کی زندگی کے بہت سے اہم حالات و واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔ یہ دونوں مضامین "میثاق" کے جون اور جولائی 1965ء کے شماروں میں یکے بعد دیگرے شائع ہوئے:

> "بیس مئی 1965ء کو قاہرہ کے قریب پی آئی اے کے طیارے کو جو الم ناک حادثہ پیش آیا وہ یوں تو پورے پاکستان کا ایک المیہ ہے، ہماری پوری قوم کو اس سے صدمہ پہنچا ہے اور میں اس قوم کے ساتھ برابر کا شریک ہوں، لیکن میرے لیے یہ حادثہ دوہرے رنج و غم کا باعث ہوا ہے۔ اس لیے کہ میرے جوان بیٹے ابو صالح اصلاحی نے بھی اس حادثے میں شہادت پائی ہے۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا ایک کم زور انسان ہوں۔ عام حوادث سے بھی، جن کی خبریں اخباروں میں روز چھپتی رہتی ہیں، بہت زیادہ متاثر ہوتا ہوں پھر ایک ایسے حادثے کے اثرات سے اپنے دل کو کیسے بچا پاتا جس نے میرے پورے آشیانے کو سوخت کر کے رکھ دیا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ دن مجھ پر بہت سخت گزرے ہیں۔ اتنی عمر میں ایسے سخت دن مجھ پر

نہیں گزرے تھے۔ اگرچہ حادثے کی خبر سنتے ہی میں نے اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالے کر دیا تھا کہ اے رب، اگر یہ تیرے غضب کا نتیجہ نہیں ہے تو میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں۔ تو مجھے ضرور صبر و رضا کی توفیق عطا فرما، لیکن اس کے باوجود اس دوران میں میری عقل اور میرے دل میں برابر ایک جنگ برپا رہی ہے اور بارہا میں نے شب کی تنہائیوں میں یہ محسوس کیا ہے کہ میرے جذبات میری عقل پر غالب آ رہے ہیں۔ لیکن اب ان جذبات کا ذکر چھیڑ کر اپنے اور اپنے ہم دردوں کے غم میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا، بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اس سلسلے میں رب کریم کی طرف سے ظہور میں آئی ہیں اور جن سے مجھے اس غم والم کے بوجھ کو ہلکا کرنے میں بڑی مدد ملی ہے۔''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سفر میں ابو صالح مرحوم نے عمرے کی نیت کی تھی اور اس لیے وہ تمام ضروری تیاریاں کر کے گھر سے نکلے تھے۔ ان کے اس ارادے کی اطلاع میرے برادر نسبتی چودھری فضل الرحمٰن محمود سلّمہ کو تو کئی ماہ پہلے سے تھی، لیکن سفر سے پہلے انھوں نے اس کی خوش خبری اپنی امی کو اور ان کی وساطت سے گویا مجھے بھی دے دی تھی۔ میں مئی کے شروع میں زمین داری کے انتظامات کے سلسلے میں اپنے رقبے پر چلا گیا تھا۔ وہاں مجھے یکے بعد دیگرے ایسے کام پیش آتے گئے کہ توقع سے زیادہ دن لگ گئے۔ میری اس غیر معمولی تاخیر سے گھبرا کر میری اہلیہ اور میری چھوٹی لڑکی بھی وہیں پہنچ گئے۔ حادثے سے ایک دن پہلے میری اہلیہ نے ذکر کیا کہ ابو صالح مشرقِ وسطیٰ کے سفر پر جا رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ کیا نئی بات ہوئی؟ وہ تو چین ماچین، امریکہ اور انگلستان برابر جاتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا: نہیں، بات یہ ہے کہ اب کہ انھوں نے عمرے کی نیت کی ہے۔ میرے پاس آئے تو کہتے تھے کہ امی آپ تو مجھے دین سے بے پروا سمجھتی ہیں، لیکن میں عمرے کی نیت کیے ہوئے ہوں۔ اس سفر سے عمرہ کر کے لوٹوں گا۔ میں دن میں دفتر کے کام کرتا ہوں۔ رات کو حج کی دعائیں یاد کرتا ہوں۔ حج کے سفر نامے میں نے کئی ایک پڑھ رکھے ہیں۔ اگر کوئی ایسا سفر نامہ آپ نے پڑھا ہو جس میں حج کی روحانیت بیان ہوئی ہو تو وہ مجھے بتائیے۔ ابا جان سے بھی پوچھیے گا۔ میں نے کہا ہاں یہ خبر تو بے شک نئی خبر ہے۔ اس طرح سے مجھے فی الواقع بڑی خوشی ہوئی تھی۔''

یاد رہے کہ ابو صالح کا اپنی جس والدہ کے ساتھ تعلقِ خاطر کا اظہار ہو رہا ہے، یہ ان کی سگی

والدہ نہیں تھیں۔ ان کی حقیقی والدہ ان کے لڑکپن ہی میں وفات پا چکی تھیں۔

”ابو صالح نے اس نوجوانی کی عمر میں اخبار نویسی میں جو ناموری حاصل کر لی تھی اور زندگی کی جدوجہد میں اسے جو کامیابی پر کامیابی حاصل ہو رہی تھی وہ اگر ایک طرف قابل رشک تھی تو دوسری طرف ایک خاص پہلو سے میرے لیے وجہِ تشویش بھی تھی۔ میرا دل اندر سے ڈر رہا تھا کہ مبادا ان کامیابیوں کا نشہ اس کو آخرت سے غافل کر دے۔ چنانچہ میں اس کے لیے برابر دعا کرتا تھا کہ اے رب، تو نے اس کو دنیا دی ہے تو ہی دین کی راہ بھی اسے سُجھا۔ اس کی امی برابر جب وہ ہم سے ملنے آتا نماز کی پابندی کی بحث اس سے ضرور چھیڑتی۔ میں نے بھی اس سے ایک آدھ بار کہا کہ ابو صالح تم قابل فخر بیٹے ہو اگر تم دین دار بن جاؤ تو میں تمھارے جیسے بیٹے پر اپنے رب کا شکر بھی ادا کروں۔“

یاد رہے ابو صالح فرائض کی ادائیگی سے ہر گز غافل نہیں تھے، لیکن مولانا اپنے بیٹے سے جس درجے کی پابندی اور آمادگی کی توقع کرتے تھے، یہ تنبیہ اور تذکیر اسی حوالے سے ہے:

”اس میں غفلت ضرور تھی، لیکن طبیعت بڑی نصیحت پذیر تھی۔ دین کے لیے اس میں حمیت بھی بہت تھی۔ اب میں اس کی اس غربت (یعنی وطن سے دوری) کی موت کا خیال کرتا ہوں، ان آگ کے شعلوں کا تصور کرتا ہوں جن میں اس کا جسم اور میرا دل کباب ہوا ہے، ایک حریق اور غریق مومن کے لیے اس شہادت کو یاد کرتا ہوں جس کا ذکر حدیثوں میں ہے اور پھر اس کی عمر کے اس نیت کا دھیان کرتا ہوں تو میرا سینہ اچھی امید سے لبریز ہو جاتا ہے کہ کیا عجب کہ رب کریم و رحیم نے اس الھڑ نوجوان کو اپنی جنت میں لے جانے کے لیے یہ مختصر راستہ ہی پسند فرمایا ہو۔ یہ امید میرے غم کو اتنا کم کر دیتی ہے کہ بعض اوقات تو میں ایسے محسوس کرنے لگتا ہوں کہ گویا کوئی حادثہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا۔“

مولانا نے ان سطور میں جس حدیث کا حوالہ دیا ہے، وہ یہ ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ	”حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قال: ...	کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
الشُّهَدَاءُ خَمْسَةٌ: الْمَطْعُونُ،	فرمایا:... شہید پانچ ہیں: طاعون میں
وَالْمَبْطُونُ، وَالْغَرِيقُ، وَصَاحِبُ	مرنے والا، پیٹ کی بیماری سے مرنے

الْهَدْمِ، وَالشَّهِيدُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ. (مسلم، رقم 1914)

والا، ڈوب کر مرنے والا، ملبے کے نیچے دب کر مرنے والا اور اللہ کی راہ میں شہید ہونے والا۔‘‘

’’کتنوں نے غائبانہ نماز جنازہ پڑھی ہے اور کتنوں کے خطوط۔ ان کی ملاقاتوں سے میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کے دل اس حادثے سے مجھ سے بھی زیادہ زخمی ہیں۔ بہتوں نے اطلاع دی ہے کہ ہم اور ہمارے اہل و عیال راتوں کو اٹھ اٹھ کر رو رو کر مرحوم کے لیے دعائیں کر رہے ہیں۔ ان میں سے عوام کے ساتھ ایسے علما اور صلحا بھی شامل ہیں جن کے علم و تقویٰ کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔ میں یہ ہمہ گیر تاثر جب دیکھتا ہوں تو اس کا اہل اپنے آپ کو پاتا ہوں نہ مرحوم ابو صالح کو۔ مجھے یہ چیز بالکل خدا ساز نظر آتی ہے۔ رب کریم و کارساز نے جب اپنے ایک بندے کو اپنی رحمت سے نوازنا چاہا تو اس کی موت کو ایسی شکل دی کہ اس کے لیے بے شمار ہاتھ دعا کے واسطے، روتی ہوئی آنکھوں، تڑپتے ہوئے دلوں کے ساتھ خود بخود اٹھ گئے۔ اب میں یہ گمان کس طرح کروں کہ دعا کے لیے جو ہاتھ اس نے خود اٹھوائے ہیں، انھیں وہ محروم لوٹائے گا! اس خیال سے میری روح مسرت سے وجد میں آجاتی ہے اور سارا غم والم کافور ہو جاتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ میرے بعض بزرگوں اور ہم دردوں نے اس حادثے پر مجھ سے تعزیت کے بجاے مبارک باد لکھیں۔ یہ مبارک باد دینے والے حضرات علم اور تقویٰ، دونوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ میں یہ حسن ظن رکھتا ہوں کہ انھوں نے مجھے محض تسلی دینے کے لیے مبارک باد نہیں دی ہے، بلکہ ابو صالح کی یہ موت ان کے نزدیک فی الواقع شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ شہادت کا درجہ ایک بڑا درجہ ہے۔ اگر ابو صالح نے یہ درجہ حاصل کیا تو بہت بڑا درجہ حاصل کیا۔ شہادت کی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان۔ میں تصور بھی نہیں کرتا تھا کہ میرے حقیر خاندان میں کوئی اس درجے کا سزاوار قرار پائے۔ جب میں اس کے اس درجہ کا خیال کرتا ہوں یہ یقیناً رب کریم نے محض اپنے فضل سے بخشا تو میری روح اپنے رب سے سخت شرمسار ہوتی ہے کہ میں نے ابو صالح کی موت کا غم کیوں منایا؟ اس پر سجدۂ شکر کیوں نہ بجالایا۔ اللہ تعالیٰ ان تمام دوستوں اور بزرگوں کو جزاے خیر دے، جنھوں نے اس حقیقت کی طرف مجھے توجہ دلائی۔

ایک اور چیز جو سب سے زیادہ میرے غم کو دور کرنے میں مُعین ہوئی وہ میرے ایک دیرینہ

دوست کا خواب ہے۔ میں اگرچہ خواب کی باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا، لیکن یہ ایک ایسے شخص کا خواب ہے، جس کے خوابوں کے سچا ہونے کا مجھے ذاتی تجربہ ہے۔ میں ایک زمانے میں ان کے ساتھ کم و بیش دس ماہ بورسٹل جیل اور لاہور سینٹرل جیل میں گزار چکا ہوں۔ اس زمانے میں انھوں نے پیش آنے والے معاملات سے متعلق نہایت حیرت انگیز خواب دیکھے اور ان کے سارے خواب سچے ثابت ہوئے۔ انھوں نے 30 اور 31 مئی کی درمیانی رات میں صبح تقریباً چار بجے خواب دیکھا جو خود ان کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں:

''ابو صالح اصلاحی مرحوم رات کے لباس میں ملگجے رنگ کے بوشرٹ اور پاجامے میں ملبوس، ہشاش بشاش نظر آئے۔ کہنے لگے مجھے صرف آدھ گھنٹا تکلیف رہی۔ اب میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ یہ بات انھوں نے دو تین دفعہ کہی۔ میں نے کہا: آپ کے والد مولانا اصلاحی صاحب اس حادثے کی وجہ سے سخت غم زدہ ہیں۔ کہنے لگے: ہاں ٹھیک ہے، انھیں سخت غم ہے۔ کیوں نہ ہو؟ اب پوری ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آن پڑی ہیں۔ نیز کہنے لگے آپ میرا پیغام جو اوپر نقل ہوا ہے، میرے گھر والوں کو پہنچا دیں۔ میں نے کہا... اور احساس یہ تھا کہ میں یہ خواب جو دیکھ رہا ہوں، یہ خواب کی باتیں شاید وہ مانیں یا نہ مانیں۔ میں جا کر کیا میسج دوں گا؟ لیکن انھوں نے بااصرار دو تین دفعہ کہا کہ آپ کو اس سے کیا؟ آپ پیغام دے دیں اور وہ مانیں یا نہ مانیں، ان کی مرضی۔''

خواب خاصا لمبا تھا باتوں کی ترتیب پوری طرح یاد نہیں رہی، لیکن گفتگو کے وہ حصے ذہن پر ابھی تک نقش ہیں جو اوپر لکھ دیے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی دیکھا کہ ان کے تین چار دوست ان کے قریب ادھر ادھر پھر رہے ہیں اور بغیر ڈاڑھی مونچھ کے سفید قمیض اور پتلون میں ملبوس ہیں۔ ان میں سے ایک نے ابو صالح سے پوچھا: بھائی نماز کا وقت ہو رہا ہے۔ اس وقت واقعی فجر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ اب وضو کرنا ہے، جگہ تو بتاؤ۔ اس پر ابو صالح نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میرے میز والے کمرے کے ساتھ غسل خانہ ہے۔ وہاں وضو کر لیں۔

اس خواب کی تعبیر تو ارباب تعبیر ہی بتائیں گے، لیکن چند باتیں اس کی مجھ پر بالکل واضح ہیں اور وہی میرے لیے باعثِ اطمینان و تسلی ہیں۔

ایک تو یہ خواب دیکھنے والے ایک ایسے صاحب ہیں، جن سے اگرچہ ایک مدت سے میرا کوئی ربط ضبط نہیں ہے، لیکن وہ واحد شخص ہیں جن کے بارے میں میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ان کے

خواب سچے ثابت ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے واسطے سے ابو صالح مرحوم کا کوئی پیغام میرے لیے اطمینان کا پہلو رکھتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حادثے کے بعد دو تین دنوں کے اندر اندر میں نے غم کے تمام اسباب کا تجزیہ کر کے ان میں سے اکثر پر قابو پا لیا تھا، لیکن ایک سوال میرے لیے برابر سوہان روح رہا ہے کہ حادثے کے وقت اور حادثے کے بعد رب کریم نے ابو صالح کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ رات میں جب یہ سوال میرے ذہن پر مسلط ہو جاتا ہے تو نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ میرے دل میں یہ خواہش بھی بارہا پیدا ہوئی کہ کوئی بات میرے سامنے ایسی آئے جس سے میرے دل پر یہ پہاڑ ذرا سا سرکے۔ خواب ہی میں سہی، لیکن میں خود خواب اول تو دیکھتا کم ہوں جو دیکھتا ہوں، وہ یاد نہیں رہتے، اب جب سے یہ خواب علم میں آیا ہے، خیال یہی گزرتا ہے کہ یہ میرے اسی سوال کا جواب ہے اور اگر یہ واقعی میرے سوال کا جواب ہے تو بہت ہی خوب اور نہایت ہی مبارک خواب ہے۔

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست"

یہ سعدی شیرازی کا مصرع ہے۔ پورا شعر اور مفہوم یہ ہے:

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست
کہ عاشق چنین شادماں کم رواست

"یہ خوش خبری اتنی عظیم ہے کہ اگر میں اس پر اپنی جان بھی قربان کر دوں تو بھی کم ہے، کیونکہ عاشق کو ایسی مسرت کم ہی نصیب ہوتی ہے۔"

"خواب میں ابو صالح کے لباسِ شب خوابی کا جو رنگ نمایاں ہوا ہے، گھر میں دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کے سلیپنگ سوٹ کا رنگ فی الواقع یہی تھا۔ اس دوران میں ان کا وہ کمرا جس میں ان کے کھانے کی میز ہے، ان کے غسل خانے سے متصل ہے۔ ان چیزوں کا کوئی تصور خواب دیکھنے والے صاحب کو پہلے سے نہیں تھا۔"

خواب دیکھنے والے یہ صاحب جماعت اسلامی کے امیر مرحوم میاں طفیل محمد صاحب تھے۔

[باقی]

عربی ادب قبل از اسلام 5

ڈاکٹر خورشید رضوی

قدیم عرب کا دیگر اقوامِ عالم سے ربط ضبط اور اجنبی ثقافتوں کا اثر

یہ درست ہے کہ تین طرف سے سمندر نے اور ایک طرف سے صحرائے نفود نے جزیرہ نمائے عرب کا پیوند زمانے سے جدا کر رکھا ہے تاہم، جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں، وسیع تر تناظر میں یہ جزیرہ نما ایک تضاد بھی پیش کرتا ہے اور ایشیا، افریقہ اور یورپ کے اثرات ایک دوسرے تک منتقل کرنے میں ایک اہم واسطے کا کردار بھی ادا کرتا رہا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرتے ہوئے یہ سرزمین خود بھی مختلف النوع ثقافتوں کے اثرات سے یکسر بے بہرہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اسی بنیادی تضاد کے بہت سے پَرتو قدیم عرب کی تاریخ پڑھتے ہوئے سامنے آتے ہیں۔ اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ ہر چند عربوں کی ایک بڑی اکثریت تہذیب و تمدن سے دور خانہ بدوشی اور صحرانشینی کی زندگی بسر کر رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ عرب معاشرہ، من حیث الکل، کئی وسیلوں سے اُس وقت کے عظیم ترین تمدنوں سے مربوط اور متاثر بھی تھا۔ الغرض یہ تصور کرنا درست نہ ہو گا کہ جس سرزمین کی سرحدیں وقت کی دو عظیم طاقتوں، ایران اور روم کی سرحدوں سے ملتی ہوں اور جس کے بالکل متصل قدیم ترادوار میں اشوریوں، بابلیوں اور کلدانیوں کی مشہور تہذیبیں پروان

چڑھی ہوں اور حمورابی کا مجموعۂ قوانین تشکیل دیا گیا ہو اُس کی عقلی زندگی ان بیرونی اثرات سے یکسر بے علاقہ ہو گی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ عربوں کا ادب اور اُن کی زندگی اجنبی اثرات سے خالی نہیں۔[1]

کوئی بھی قوم دوسری اقوام سے جن جن وسیلوں سے اثرات کشید کرتی ہے اُن سب کی مکمل فہرست تیار کرنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے کیونکہ ان کی تفصیلات بہت دقیق ہوتی ہیں تاہم ان میں سے بعض وسیلے بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ عربوں کا دیگر اقوام سے رابطہ اور اجنبی ثقافتوں سے اثرپذیری، بیشتر، تین وسیلوں سے تھی:

(1) حیرہ اور غسان کی ریاستیں

یہ علی الترتیب ایرانی اور رومی ثقافتوں کے نفوذ کا ذریعہ تھیں اور ان کا عرب معاشرے پر کئی اعتبار سے اثر تھا۔ ان پر تفصیلی گفتگو آئندہ صفحات میں آتی ہے۔

(2) تجارت

سرزمین عرب قدیم ترین زمانوں سے ایک اہم تجارتی رہگزر رہی ہے۔ پہلے پہل جب اہل یمن عروج پر تھے تو وہ عنان تجارت پر قابض تھے۔ بعد ازاں جب اُن پر زوال آیا تو تجارت اہل حجاز کے حصے میں آگئی۔ جزیرہ نما کے وسط میں صحرا کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے اس لیے تجارتی شاہراہیں جزیرہ نما کے کناروں پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک شاہراہ حضرموت سے بحر احمر کی طرف آکر حجاز سے گزرتی ہوئی شام کو جاتی تھی۔ دوسری حضرموت سے دوسری جانب عُمان اور بحرین سے ہوتی ہوئی صورتک پہنچتی تھی۔ ظفار سے لوبان وغیرہ بیرونِ عرب لے جایا جاتا تھا اور باہر سے

---

[1]۔ ہاں یہ درست ہے کہ یہ اثرات اُن کے ہاں نمایاں اور باقاعدہ نہ تھے بلکہ سرسری اور بے ترتیب تھے اور نمایاں حیثیت ان کی اپنی صحرائی و قبائلی ثقافت ہی کو حاصل تھی۔ علاوہ ازیں بیرونی ثقافتوں کا اثر حضری زندگی پر زیادہ اور بدوی زندگی پر کم کم تھا۔

مختلف درآمدات یمن کو آتی تھیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کا سامان تجارت، مثلاً: نادر قسم کے جانور جیسے لنگور اور مور وغیرہ بھی خشکی کے راستے عرب سے ہوتا ہوا فراعنہِ مصر کو جایا کرتا تھا۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا یمن کے بعد تجارت کی باگ ڈور اہل حجاز کے ہاتھ میں آئی۔ مکہ[2] یمن سے شام کو جانے والی تجارتی شاہراہ کے تقریباً وسط میں واقع تھا اور چاہ زمزم کے سبب سے ایک اہم پڑاؤ بھی تھا علاوہ ازیں حرم کعبہ کو مذہبی تقدس حاصل تھا[3] لہٰذا قریش کو، جو وہاں کے سربرآوردہ لوگ تھے، تجارتی میدان میں خاص سہولت حاصل ہوگئی جس کا اشارہ قرآن پاک میں بھی ملتا ہے۔[4] قریش کے تاجر حبشہ کا سامان تجارت بھی شام کی منڈیوں میں لے جایا کرتے تھے۔ اُن کے قافلے بہت عظیم الشان ہوتے تھے اور ظاہر ہے کہ اُن میں، ترجمانی کی غرض سے، ایسے افراد بھی شامل ہوتے تھے جو غیر زبانوں سے آگاہی رکھتے ہوں۔ پھر یہ کہ عرب کے چنے ہوئے ذہن، مثلاً: ابوسفیان، مخرمہ بن نوفل اور عمرو بن العاص جیسے لوگ ان قافلوں میں شامل ہوتے تھے جو بنظر غائر بیرونی ثقافتوں کا مشاہدہ کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ اس تجارتی شاہراہ پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی پہلے بارہ برس کی عمر میں جناب ابوطالب کے ہمراہ اور بعد ازاں پچیس برس کی عمر میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے اموال کے سلسلے میں شام کا سفر اختیار فرمایا۔

صحرا نشین قبائل بھی ان تجارتی سرگرمیوں سے یکسر لاتعلق نہ تھے۔ تجارتی قافلے لوٹ مار سے محفوظ رہنے نیز راستہ معلوم کرنے کی غرض سے ان قبائل کو اُجرت پر راہنما یا محافظ بنا لیتے تھے۔ اَن پڑھ اور لوٹ کھسوٹ کے عادی ہونے کے باوجود یہ لوگ اس لیے قابل اعتماد تھے کہ اپنی بات کے پکے تھے اور خلاف پیمان کوئی عمل نہ کرتے تھے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ اگر کسی زیادہ طاقتور قبیلے کے حملے کے باعث وہ خود کو قافلے کی حفاظت سے قاصر پاتے تھے تو اُجرت لوٹا دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ ان تجارتی سرگرمیوں کے باعث عربوں کا دوسری اقوام سے، اور پھر آپس میں، جو اختلاط رہتا تھا اُس کے نتیجے میں بیرونی ثقافتوں کا نقش عربوں کی عقلی زندگی پر بیٹھتا

---

[2]۔ موازنہ کیجیے: مکہ کی اہمیت کے ضمن میں ص20 ج2۔

[3]۔ یہ تقدس دور جاہلیت میں بھی موجود تھا۔ دیکھیے: القرآن، 28:57، 29:67۔

[4]۔ قریش 106:1-2، جہاں جاڑے اور گرمی کے سفر کا ذکر ہے۔

رہتا تھا۔ عربی میں ایرانی، رومی، مصری اور حبشی زبانوں کے جو دخیل الفاظ ہیں اُن کے عربی میں داخل ہونے کا ایک سبب یہ تجارتی ربط ضبط بھی تھا۔

(3) یہودیت اور نصرانیت

اجنبی ثقافتوں کو عرب میں راہ دینے والا تیسرا اہم وسیلہ یہودیت اور نصرانیت تھی۔ طلوع اسلام سے کئی صدی پہلے کچھ یہودی اسکندریہ اور روم سے یہاں آکر آباد ہوئے[5] اور بعد ازاں اُن کے اثر سے بعض عرب قبائل نے بھی یہودیت قبول کرلی۔ چنانچہ تیماء، فدک، خیبر، وادی القُریٰ اور سب سے بڑھ کر یثرب یہود کا مرکز تھا۔ بنو نضیر، بنو قینقاع اور بنو قریظہ مشہور یہودی قبائل تھے۔ اسکندریہ اور روم کی فلسفیانہ ثقافتوں کے بیج یہود اپنے ساتھ لائے تھے اور چونکہ روم اور اسکندریہ دونوں یونانی ثقافت کے وارث تھے لہٰذا یونانیت کا پَرتو بھی بالواسطہ ان لوگوں کی معاشرت میں موجود تھا۔ یہ لوگ کاشتکاری کے علاوہ بعض صنعتوں، مثلاً: اسلحہ سازی، آہنگری اور زرگری میں بھی ماہر تھے۔ یہودیوں ہی کی وساطت سے قدیم عرب معاشرے میں دنیا کی پیدایش کی تاریخ، مرنے کے بعد کی زندگی اور حساب اور میزان وغیرہ عقائد سے متعلق طول طویل روایات و تفاسیر کے ایک سلسلے نے شہرت پائی جو بعد کے زمانوں میں اسلامی لٹریچر میں بھی راہ پا گیا۔[6] جہنم، ابلیس اور شیطان جیسی مذہبی اصطلاحات سے بھی پہلے پہل یہود ہی کی وساطت سے عربوں کو شناسائی ہوئی۔

اسی طرح نصرانیت نے عربوں میں حبشی، رومی اور یونانی اثرات کی نمایندگی کی۔ عیسائیت کے مختلف فرقوں میں سے فرقۂ یعقوبیہ اور فرقۂ نسطوریہ عرب میں نمایاں نظر آتے ہیں چنانچہ حیرہ اور غسّان میں علی الترتیب نسطوری اور یعقوبی عقائد پائے جاتے تھے۔ عیسائیت کا سب سے بڑا مرکز نجران تھا۔ یہ لوگ بڑی منظم زندگی بسر کرتے تھے۔ ''سیّد''، ''عاقب'' اور ''اُسقُف''، علی

---

[5]۔ غالباً یہ لوگ اپنی کتابوں کے لکھے کے مطابق نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے منتظر تھے اور اسی لیے یہاں آئے تھے۔

[6]۔ فجر الاسلام، 23-25۔ ایسی روایات کو اصطلاح میں ''اسرائیلیات'' کہتے ہیں۔

الترتیب، ان کے خارجی، داخلی اور مذہبی امور کو سنبھالنے والے سربراہوں کے لقب تھے۔ ریشمی لباس اور ہتھیار بنانے میں ان کو مہارت حاصل تھی۔ عربی ادب میں جابجا جن یمنی چادروں اور یمنی پوشاکوں کا ذکر ملتا ہے وہ انھی سے منسوب ہیں۔ روایت ہے کہ مشہور خطیب قس بن ساعدہ نجران ہی کا اسقف تھا۔[7]

عیسائیت کے اثر سے عربوں میں کائنات کے مظاہر پر غور کرنے اور رہبانیت کی زندگی بسر کرنے کا میلان پیدا ہوا چنانچہ حنظلۃ الطائی کے بارے میں روایت ہے کہ اس نے اپنے قبیلے کو چھوڑ کر ایک خانقاہ بنائی تھی اور وہیں گوشہ گیری کے عالم میں اُس کی وفات ہوئی۔ قس بن ساعدہ کے بارے میں بھی ایسی ہی روایات ملتی ہیں کہ وہ اجاڑ جگہوں میں رہتا تھا، بہت کم کھاتا تھا اور جنگلی جانوروں سے مانوس تھا۔ عدی بن زید اور نعمان شاہِ حیرہ کے بارے میں بھی کچھ ایسے ہی حالات منقول ہیں۔ امیہ بن ابی الصلت، عدی بن زید اور قُس بن ساعدہ کے اشعار میں بھی زہد و رہبانیت کا عنصر نمایاں ہے۔

عربی زبان میں بعض الفاظ و تراکیب کا اضافہ بھی نصرانی میلانات کے وسیلے سے ہوا چنانچہ بعض روایات کے مطابق ”امابعد“ کا لفظ سب سے پہلے قُس بن ساعدہ نے استعمال کیا اور ”باسمك اللّٰھم“ امیہ بن ابی الصلت نے۔ اُمیہ کے اشعار میں بعض ایسے نامانوس الفاظ بھی ملتے ہیں جو اس نے قدیم کتابوں سے اخذ کیے تھے، مثلاً: اُس نے خدا کے لیے ”سلطیط“ اور ”تغرور“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔[8]

[باقی]

---

[7]۔ تاہم یہ مسئلہ اختلافی ہے مستشرق لامانس (Lammens) کے خیال کے مطابق قُس بن ساعدہ کا نجران سے کوئی تعلق نہ تھا۔ (فجر الاسلام، 26)

[8]۔ اس باب کی معلومات کا انحصار بیشتر فجر الاسلام، 12-29 پر ہے۔

ڈاکٹر خورشید رضوی

کہاں ہوں میں کہ مرا کوئی آشنا بھی نہیں
کسی کا ذکر تو کیا گھر میں آئنہ بھی نہیں

رہے خموش تو ٹوٹا نہ رشتۂ امید
پکارتے تو خرابوں میں کوئی تھا بھی نہیں

تری صدا پہ تو صدیاں بھی لوٹ آتی ہیں
مجھے بلا میں کچھ ایسا شکستہ پا بھی نہیں

یہ اور بات کہ نقش قدم دکھائی نہ دیں
مگر وہ عرصۂ دل سے ابھی گیا بھی نہیں

اس اعتراف سے رس گھل رہا ہے کانوں میں
وہ اعتراف جو اس نے ابھی کیا بھی نہیں

جس ایک چیز سے تیرا فراق آساں ہے
وہ ایک چیز تری یاد کے سوا بھی نہیں

مرا بھرم ہیں تغافل شعاریاں تیری
تو پوچھ لے تو مرا کوئی مدعا بھی نہیں

مصالحت بھی نہیں ہے سرشت میں اپنی
مگر کسی سے تصادم کا حوصلہ بھی نہیں

نہ جانے کب نہ رہیں ہم ہمیں غنیمت جان
حیات و موت میں کچھ ایسا فاصلہ بھی نہیں

مآل کار قناعت ہے سو ابھی سے سہی
وگرنہ طول تمنا کی انتہا بھی نہیں

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

پھر ہوئے زینتِ دیوارِ حرم اے ساقی
توڑ ڈالے تھے جو پتھر کے صنم اے ساقی

راہ رو گرمِ سفر پشت بہ منزل ہو کر
ہے یہی آج بھی تقدیرِ امم اے ساقی

مے کدہ چھوڑ تو دیں تیری جفا پر، لیکن
یاد آ جاتا ہے پھر تیرا کرم اے ساقی

تیری صحبت ہی وہ فردوس ہے دنیا میں جہاں
کوئی اندیشۂ فردا ہے، نہ غم اے ساقی

روے زیبا نہ سہی، گردشِ مینا ہی سہی
کچھ تو رہ جائے فقیروں کا بھرم اے ساقی

روح خاموش ہے صدیوں سے، بدن گرمِ سرود
اب کہاں سوزِ عرب، سازِ عجم اے ساقی!

ہم وہ مے کش ہیں کہ منت کشِ صہبا نہ ہوئے
مانگ لائے ہیں رگِ تاک سے نم اے ساقی

دین تو تھا ہی، سیاست بھی ہے ملا کے سپرد
اور باقی ہے کوئی ہم پہ ستم اے ساقی؟

عقل ہو جاتی ہے منزل سے گریزاں جب بھی
دیکھ لیتے ہیں ترا نقشِ قدم اے ساقی

شاہد محمود

خبر نامہ ”المورد امریکہ“

[فروری 2026ء]

ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث

جنوری 2026ء میں غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری غامدی صاحب کے لائیو درسِ قرآن و حدیث کی نشستوں میں غامدی صاحب نے سورۂ مومنون کی آیات 44 تا 118 اور سورۂ نور کی پہلی دو آیات کا درس دیا، جب کہ درس حدیث کی نشستوں میں طہارت کے احکام سے متعلق روایات پر گفتگو کی گئی۔ درس حدیث کی ان نشستوں میں زیر بحث آنے والے چند اہم نکات یہ ہیں: ”قرآن کو ہاتھ لگانے سے پہلے طہارت حاصل کرنا“، ”جنابت کے پانی سے متعلق ایک اشکال کا بیان“، ”کیا جنابت کے بعد فوراً غسل کرنا لازم ہے؟“ اور ”کیا جنابت میں انسان ناپاک ہو جاتا ہے؟“۔ قرآن و حدیث کے دروس کی ان نشستوں کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

”ورلڈ ریلیجن پاڈ کاسٹ“

گذشتہ ماہ حسن الیاس صاحب نے ”ورلڈ ریلیجن پاڈ کاسٹ“ کے عنوان سے ایک پروگرام ریکارڈ کرایا۔ اس کا بنیادی مقصد مختلف عالمی مذاہب، بالخصوص اسلام اور ہندومت کے درمیان

مکالمے کے ذریعے سے فکری ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ اس پروگرام میں مذہب کو محض روایتی تناظر میں دیکھنے کے بجاے عقلی اور منطقی بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس پروگرام میں زیر بحث آنے والے چند اہم نکات یہ ہیں: ''اسلام کیا ہے اور کب شروع ہوا؟''، ''اسلام کی تعریف اور حقیقت کیا ہے؟''، ''کیا اسلام دوسرے مذاہب سے مختلف ہے؟'' اور ''جدید دور میں الحاد کا چیلنج''۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''افکارِ غامدی''

منظور الحسن صاحب کا ہفتہ وار یوٹیوب پروگرام ''افکارِ غامدی'' غامدی صاحب کے نظریات کو عام فہم انداز میں لوگوں تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس پروگرام میں غامدی صاحب کے افکار کی سادہ زبان میں وضاحت کی جاتی ہے۔ جنوری 2026ء کی نشستوں میں جن اہم موضوعات پر گفتگو کی گئی، ان میں ''علم کی زبان کیا ہے؟''، ''غامدی صاحب کی نصیحت: سچے طالب علم بنیں''، ''کیا ریاست شخصی معاملات میں مداخلت کر سکتی ہے؟'' اور ''کیا عالم کی دعوت کو دین کی دعوت کہنا درست ہے؟'' قابلِ ذکر ہیں۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

''استفسار: ڈاکٹر عمار خان ناصر کے ساتھ''

غامدی سینٹر کے پلیٹ فارم سے جاری سوال و جواب کے مقبول سلسلے ''استفسار: ڈاکٹر عمار خان ناصر کے ساتھ'' کی جنوری 2026ء کی نشستوں میں زیر بحث آنے والے چند اہم سوالات یہ ہیں: ''روایت اور تجدد کے حدود کیا ہیں؟''، ''تفاسیر میں اختلاف کیوں؟''، ''غدیر خم والی حدیث میں اہل بیت سے کون مراد ہیں؟'' اور ''فرقہ بازی میں نہ پڑنے سے کیا مراد ہے؟''۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

Ask Ghamidi

غامدی صاحب سے براہِ راست دینی و اخلاقی موضوعات پر رہنمائی حاصل کرنے کے لیے

غامدی سینٹر کے زیرِ اہتمام ہر ماہ ایک آن لائن نشست منعقد کی جاتی ہے۔ اس نشست کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگ اپنے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب براہ راست غامدی صاحب سے حاصل کر سکیں۔ جنوری 2026ء کی نشست میں پوچھے جانے والے چند اہم سوالات یہ ہیں: ''صرف عمرہ کرنے سے حج ادا ہو جاتا ہے؟''، ''قبرستان جانے کے آداب کیا ہیں؟''، ''کیا تصوف کے بغیر روحانی سکون ممکن ہے؟'' اور ''نبوت کا انکار توہین کیوں نہیں؟''۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''ٹیپو سلطان اور نظام حیدر آباد: دو کردار، دو رویے، دو نتائج''

محمد حسن الیاس صاحب نے اپنے اس مضمون میں ٹیپو سلطان اور نظام حیدر آباد کے کرداروں کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو مختلف تاریخی رویوں، یعنی جذباتی مزاحمت اور حقیقت پسندانہ تدبیر کا موازنہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جہاں ٹیپو سلطان کی شجاعت نے شہادت کا لازوال رومان پیدا کیا، وہیں نظام حیدر آباد نے بدلتی حقیقت کو بھانپ کر ادارہ سازی اور علم کے ذریعے سے قوم کی بقا کا راستہ نکالا۔ مضمون کا لبِ لباب یہ ہے کہ قوموں کو مستقل عزت اور استحکام محض جذباتی نعروں سے نہیں، بلکہ طویل المیعاد حکمتِ عملی، تعلیم اور مستحکم اداروں کی بنیاد رکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے جنوری 2026ء کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

''اللہ کی اطاعت کو نبی کی اطاعت سے معلق کرنے کا مطلب''

منظور الحسن صاحب کا یہ مضمون جناب جاوید احمد غامدی کی ایک گفتگو سے ماخوذ ہے، جس میں اللہ کی اطاعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے معلق کرنے کی تشریح کی گئی ہے۔ مضمون میں یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانوں کے لیے الٰہی ہدایت کے حصول کا واحد اور مستند ذریعہ صرف انبیاے کرام کی ذات ہے، کیونکہ وحی اور حقائقِ غیب تک رسائی صرف انھی کو عطا کی جاتی ہے۔ روے زمین پر اب دین کا تنہا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ہستی ہے اور آپ ہی کے قول و فعل سے قیامت تک ہدایت میسر آ سکتی ہے۔ یہ مضمون ''اشراق'' امریکہ کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

''سوال وجواب حسن الیاس کے ساتھ''

جنوری 2026ء میں معروف یوٹیوب چینل ''مسلم ٹوڈے'' پر محمد حسن الیاس صاحب کے جاری پروگرام ''Ask Hassan Ilyas'' میں زیر بحث آنے والے چند اہم سوال یہ ہیں: ''خودکشی جرم یا قابل رحم؟''، ''طلاق کا درست طریقہ کیا ہے؟''، ''کیا فرد نفاذِ شریعت کا اعلان کر سکتا ہے؟'' اور ''کیا خدا پر ہمارا یقین بغیر دلیل کے ہے؟''۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

سہ ماہی ''صالحات''

جی سی آئی ایل کے پلیٹ فارم سے خواتین کے لیے شائع ہونے والے سہ ماہی جریدے ''صالحات'' کا جنوری تا مارچ کا تازہ شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ اس جریدے میں خواتین کے لیے خاص طور پر علمی، ادبی اور سماجی موضوعات پر دل چسپ اور آسان اردو میں تحاریر شائع ہوتی ہیں۔ تازہ شمارے کے اہم مضامین میں حسن الیاس صاحب کا مضمون ''عورت کی تادیب: مخاطب شوہر یا معاشرہ؟''، محترمہ نسرین خان کا سفر نامہ ''دل دروازے''، ثوبیہ نورین صاحبہ کا مضمون ''لڑائی جھگڑے'' اور فابیہ احسان صاحبہ کا مضمون ''طلاق کے ممنوعات'' اور دیگر تحریریں بھی شامل ہیں۔ اس شمارے کے مدیر نعیم احمد بلوچ صاحب ہیں اور نائب مدیر وجیہہ حسان واحدی صاحبہ ہیں۔

''تفہیم الآثار'' سیریز

غامدی سینٹر کے علمی پروگرام ''تفہیم الآثار'' میں صحابہ و تابعین سے منسوب آثار کی شرح اور ان پر مبنی سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہے۔ اس پروگرام کی میزبانی ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن کر رہے ہیں، جب کہ ڈاکٹر عمار خان ناصر بہ طور مہمان شریک ہیں۔ جنوری 2026ء کی نشستوں میں جن اہم موضوعات پر گفتگو کی گئی، ان میں سے چند یہ ہیں: ''حضرت علی اور روایتِ حدیث''، ''سیدہ عائشہ اور روایتِ حدیث''، ''سیدنا ابو ہریرہ اور روایتِ حدیث'' اور ''قرآن کی ہر آیت پر کبھی نہ کبھی عمل ہو گا؟''۔ ان پروگراموں کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

”صلاۃ التسبیح: فقہ و حدیث کی روشنی میں“

ڈاکٹر عامر گزدر نے اپنے اس تحقیقی مضمون میں صلاۃ التسبیح سے متعلق سیدہ ام سلمہ، سیدنا عباس اور فضل بن عباس رضی اللہ عنہم سے مروی روایات کا فنی و تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اسانید کے تفصیلی مطالعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ ان تمام طرق میں کذاب، متروک اور مجہول راویوں کی موجودگی کے باعث یہ روایات ثبوت کے درجے تک نہیں پہنچتیں اور علمی اعتبار سے ’موضوع‘ یا ’ضعیف‘ ہیں۔ لہٰذا فنِ روایت کی روشنی میں ان احادیث سے صلاۃ التسبیح کے اثبات کے لیے استدلال کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ یہ مضمون ”اشراق“ امریکہ کے جنوری 2026ء کے شمارے میں دیکھا جاسکتا ہے۔

”مولانا اصلاحی کا تعلیمی مشن اور ابو صالح اصلاحی کی یادیں“

نعیم بلوچ صاحب نے ”حیات امین“ کی جنوری میں شائع ہونے والی قسط میں مولانا اصلاحی کی علمی مصروفیات اور ان کے صاحب زادے ابو صالح کی زندگی کے اہم واقعات اور طیارہ حادثے میں ان کی الم ناک وفات کا ذکر کیا ہے۔ مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مولانا اصلاحی نے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو قرآن و حدیث اور کلاسیکی عربی ادب پر مشتمل ایک جامع نصاب کے ذریعے سے فکری محاذ کے لیے تیار کیا تاکہ وہ الحاد کے خلاف دو دھاری تلوار ثابت ہوں۔ علاوہ ازیں، مولانا کے صاحب زادے اور نام ور صحافی ابو صالح اصلاحی کی 1965ء میں طیارہ حادثے میں وفات اور ان کی علمی و اخلاقی وجاہت پر آغا شورش کاشمیری کے پُر اثر تعزیتی مضمون کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے، جو ان کی پیشہ ورانہ مہارت اور پاکیزہ شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔

”ایمان و عقائد“

انگریزی دان طبقے کو جاوید احمد غامدی صاحب کی کتاب ”میزان“ کے مباحث سے روشناس کرانے کے لیے شہزاد سلیم صاحب کی ”میزان لیکچر سیریز“ جاری ہے۔ جنوری 2026ء میں اس سلسلے کے تحت ”ایمان و عقائد“ کے موضوع پر دو لیکچرز ریکارڈ کیے گئے، جو غامدی سینٹر کے

یوٹیوب چینل پر دستیاب ہیں۔

غامدی سینٹر کی آن لائن خانقاہ

معز امجد صاحب غامدی سینٹر کے پلیٹ فارم سے ہر ہفتے ''آن لائن خانقاہ'' کے نام سے ایک تربیتی نشست منعقد کرتے ہیں، جس کا مقصد انسانی نفس کی اصلاح اور اخلاقی تربیت ہے۔ اس پروگرام میں اصلاحِ نفس کے ساتھ ساتھ شرکا کے سوالات کے تسلی بخش جوابات بھی دیے جاتے ہیں۔ گذشتہ ماہ کی نشستوں میں چند نہایت اہم موضوعات پر گفتگو ہوئی، جن میں ''مینی فسٹیشن کا کیا مطلب ہے؟''، ''انسان میں تخیل کی صلاحیت''، ''انسان کی صلاحیتوں پر ماحول کا اثر'' اور ''خود آگاہی کا شعور نہ ہونا'' شامل ہیں۔ آن لائن خانقاہ کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

''اسلام اسٹڈی سرکل''

ڈاکٹر شہزاد سلیم ''اسلام اسٹڈی سرکل'' کے عنوان سے ہر ماہ ایک سیشن کا انعقاد کرتے ہیں۔ اس میں وہ مختلف دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر قرآن و حدیث کی روشنی میں گفتگو کرتے ہیں۔ یہ سیشن تین حصوں پر مشتمل ہے: پہلے حصے میں قرآن مجید کی آیات سے ایک موضوع منتخب کر کے اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں منتخب احادیث نبوی پر گفتگو ہوتی ہے۔ تیسرے حصے میں بائیبل کے کسی اقتباس کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ پروگرام کے آخر میں موضوع سے متعلق سوالوں کے جواب بھی دیے جاتے ہیں۔ اس سیشن کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ''

جنوری 2026ء میں ''دنیا نیوز'' پر نشر ہونے والے غامدی صاحب کے ہفتہ وار پروگرام ''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ'' میں ''دین پر غور و فکر کے اصول'' کے موضوع پر تین، جب کہ

''اسلام اور ریاست'' کے موضوع پر ایک پروگرام نشر ہوا۔ ان پروگراموں میں پوچھے جانے والے چند اہم سوالات یہ ہیں: ''دین پر غور و فکر کرنے میں حدیث کس حد تک معاون ہو سکتی ہے؟''، ''کیا انگریزی کیلنڈر کو اختیار کرنا شرک ہے؟''، ''ریاست فطری حقیقت ہے یا جدید دور کی ایجاد؟'' اور ''کیا ریاست کی موجودہ شکل انسانی فطرت کا اظہار ہے؟'' ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

سماجی و خاندانی مسائل کے حل کے لیے شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن مشاورتی سیشنز کا سلسلہ جاری ہے۔ گذشتہ ماہ منعقد ہونے والے 30 سے زائد سیشنز میں والدین کی مشکلات اور نوجوان نسل کی نفسیاتی و تربیتی الجھنوں کے حل سے متعلق گفتگو کی گئی۔ یہ نشستیں ان افراد کے لیے ایک اہم ذریعہ ثابت ہو رہی ہیں، جو اپنے نجی معاملات میں شرعی اور اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے مخلصانہ مشورہ چاہتے ہیں۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ شرعی مسائل کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے دنیا بھر میں بسنے والے مسلمانوں کی رہنمائی کا اہم مرکز بن چکا ہے۔ گذشتہ ماہ نکاح و طلاق، وراثت اور مختلف معاشی و معاشرتی معاملات سے متعلق متعدد فتاویٰ جاری کیے گئے۔ جناب جاوید احمد غامدی کے فکر کی روشنی میں یہ فتاویٰ محمد حسن الیاس صاحب نے مرتب کیے۔ واضح رہے کہ فتویٰ ایک دینی رائے کا نام ہے، یہ کوئی قانونی حکم نامہ یا عدالتی فیصلہ نہیں ہوتا۔

''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

ڈاکٹر شہزاد سلیم نے غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جنوری 2026ء میں سورۂ اعراف کی آیات 31 تا 46 کا درس پیش کیا۔ یہ اقدام اس مقصد کے تحت کیا جا رہا ہے کہ انگریزی زبان جاننے والے اہلِ علم بھی ''البیان'' کے

فہم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مذکورہ نشستوں کی ویڈیو ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دستیاب ہے۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

ڈاکٹر شہزاد سلیم ہر ماہ سوال و جواب کی لائیو نشست منعقد کرتے ہیں، جس میں وہ لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔ سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔